ایک سفرنامہ ایک ڈائری

میرے خوابوں کی سرزمین
مشرقی پاکستان

صہبا لکھنوی

مکتبۂ افکار
رابسن روڈ - کراچی،
فون : ۳۹۹۳۔

سلسلۂ مطبوعات مکتبۂ افکار

(۱۶)

قیمت
چار روپے

اشاعت اول	کتابت	طابع	ناشر	تعداد
اپریل ۶۳ء	محمود رقم	جاوید پریس	مکتبۂ افکار	ایک ہزار

فہرست

۲۴ جون

۲۷ جون

سفر کے بعد

سفر سے پہلے

پندرہ دن کی مدت اور تقریباً دس ہزار میل کا سفر
— مشرقی پاکستان جیسے وسیع و عریض خطۂ ملک کو دیکھتے
ہوئے بظاہر کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ لیکن یہ میری خوش نصیبی تھی
کہ حکومت مشرقی پاکستان کے خصوصی تعاون سے مجھے اور
میرے رفیقوں کو نہ صرف سفر و قیام اور آمد و رفت کی ممکنہ سہولتیں
میسر آگئیں بلکہ مشرقی پاکستان کے دور دراز علاقوں، کئی اہم
شہروں، صنعتوں، کارخانوں اور زیرِ عمل منصوبوں کو دیکھنے اور

کروڑوں عوام کے ان گنت مسائل کو سمجھنے اور حالات کا آزادانہ جائزہ لینے کے مواقع مل گئے۔

یہ سفرنامہ اور ڈائری اُنہیں یادوں، یادداشتوں، مشاہدات اور تاثرات کا مجموعہ ہے۔ اس میں کچھ کوتاہیاں ہوسکتی ہیں، لیکن اس کے مطالعے سے مغربی پاکستان میں رہنے والوں کو مشرقی پاکستان کے صحیح حالات و مسائل کا اندازہ لگانے میں ضرور مدد ملے گی اور مجھے یقین ہے کہ ذہنی سطح پر دونوں صوبوں کے عوام ایک دوسرے کے اور زیادہ قریب آسکیں گے۔ اس مختصر سی کتاب کو پیش کرنے کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے۔

اس کتاب میں ــ میں نے حسب ضرورت تاریخی اور جغرافیائی معلومات اور اعداد و شمار بھی شامل کئے ہیں۔ ہوسکتا ہے کچھ حضرات کو یہ باتیں سطحی اور غیر اہم معلوم ہوں ــ لیکن میں نے انہیں اہم سمجھ کر ہی شامل کتاب کیا ہے۔

اب ایک دو باتیں اور ــــــ

عام سیاست سے قطع نظر (جس کا اس سفرنامہ سے کوئی تعلق نہیں) میں نے ادب، صحافت، تاریخ، تہذیب اور معاشرت کے تقریباً ہر پہلو پر جستہ جستہ اظہارِ خیال کیا ہے اس لئے یہ کتاب

تمام تر میرے ذاتی خیالات، تاثرات، مشاہدات اور تجربات کی آئینہ دار ہے۔

اس سفر نامہ اور ڈائری کا محرک یہ جذبہ بھی تھا کہ گذشتہ پندرہ سال میں بے شمار ادیبوں اور صحافیوں کے وفد آئے گئے، لیکن اس عرصے میں ایسی مثال شاذ ہی ملے گی کہ کسی ادیب یا صحافی نے مشرقی پاکستان کے ہمہ گیر مسائل اور وہاں کی عام زندگی کا بحیثیت مجموعی جائزہ پیش کیا ہو ـــ ممکن ہے میری اس کوشش سے دوسرے ادیبوں کو اس سے زیادہ تفصیل اور وضاحت کے ساتھ مشرقی پاکستان کے بارے میں لکھنے کی ترغیب ہو۔

تیسری اور آخری بات یہ ہے کہ اردو میں اچھے سفر نامے بہت کم ہیں میں نے اسی صنف کو ذریعۂ اظہار بنایا ہے۔ کسی طور بھی میری اس کوشش سے اس صنفِ ادب میں کوئی گراں بہا اضافہ نہ ہوگا لیکن یہ امکان موجود ہے کہ دوسرے اہلِ قلم اس لطیف، دلچسپ اور مفید صنف پر متوجہ ہوں اور اس سے بہتر تصنیفات وجود میں آئیں۔

(دستخط)

۔۔۔ ۔۔۔ ۱۹۶۳ء

مشرقی پاکستان

ایک نظر میں!



صدر مقام :—— ڈھاکہ

—— ڈویژن ——

ڈھاکہ • چٹاگانگ • راجشاہی • کھلنا

مشرقی اور مغربی
پاکستان کا فاصلہ
تقریباً ۱۴ سو میل
رقبہ: ۵۴۱۱۴ مربع میل

خاص دریا
برہم پترا • پدما • میگھنا
کرنافلی • سیتا لکھیا
دھالیشری • تستا

تعلیمی اوسط:
تقریباً ۲۲ فی صدی
تعلیم یافتہ مرد: ۶۵۹۵۳۴۶
” خواتین: ۲۲۶۰۲۳۳

سرحدیں
شمال میں: مغربی بنگال اور آسام
جنوب میں: خلیج بنگال اور برما
مشرق میں: آسام اور برما
مغرب میں: مغربی بنگال

آبادی
تقریباً ۵ کروڑ
اس آبادی میں ۳ کروڑ ۳۰ لاکھ
مسلمان اور ۱ کروڑ ۷۰ لاکھ دیگر
مذاہب کے لوگ شامل ہیں

خاص جزیرے
سندیپ • ہیتا • رام گاتی
مہیش کھالی • کتب دیا

مشہور تفریحی مقامات

سندربن • کاکس بازار

تعلیمی ادارے

• یونیورسٹیاں	۳
• کالج	۸۸
• ہائی اسکول	۱۶۹۴
• جونیئر ہائی اسکول	۳۵۰
• مڈل اسکول	۱۳۷۱
• ٹیکنیکل اسکول	۱۰۱
• پرائمری اسکول	۲۶۰۰۰
• مکتب	۱۳۲۵

خاص تعمیری منصوبے

- کرنافلی کثیرالمقاصد منصوبہ
- گنگا کوباڈک منصوبہ
- تستا منصوبہ
- وسیع تر ڈھاکہ کا منصوبہ وغیرہ

معدنی وسائل

سلہٹ گیس • پتھر کا کوئلہ

ہارڈ راکس • ریفریکٹری کلے

بندرگاہ

چاٹگانگ • چالنا

دریائی گھاٹ

نرائن گنج • چاندپور

بھیرب بازار • سراج گنج

باریسال اور کھلنا

ہوائی مستقر

ڈھاکہ، چاٹگام، جیسور، کاکس بازار

خاص زراعتی پیداوار

پٹ سن • چاول • تمباکو

گنا • پھل • دالیں

تیلہن • پان

صنعتی پیداوار

کاغذ • سیمنٹ • شکر

چائے • سامان باردانہ
ربر کا سامان • سوتی کپڑا
کھالیں اور چمڑے کا سامان
پلاسٹک کی مصنوعات • ماچس
پلائی وڈ • سربند اشیا کی
صنعت، وغیرہ

خاص اشیائے برآمد

پٹ سن • سامانِ باردانہ
کھالیں اور چمڑا • تلہن
چائے • تمباکو • مچھلی
پھل اور سبزی

خاص اشیائے درآمد

سامانِ خورونوش • ادویہ
پارچہ جات • سیمنٹ • لوہا
مشینری • موٹر کاریں، وغیرہ

چند مشہور ادبی و ثقافتی ادارے

- اسلامی اکیڈیمی
- بنگلہ اکیڈیمی
- انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس
- بلبل اکیڈیمی
- انجمن ترقی اردو مشرقی پاکستان
- رائٹرز گلڈ
- انجمن ادب
- بنگلہ اردو سوسائٹی
- انجمن فردوس خیال
- دبستان فکر و نظر
- بزم شاکری

نوٹ:- گذشتہ دو سال میں تعلیمی اوسط بھی بڑھا ہے، اور تعلیمی ادارے بھی - نیز کئی نئے منصوبے، جن میں اسٹیل مل، شکر کے کارخانے، جوٹ مل وغیرہ شامل ہیں — زیرِ تکمیل ہیں -

مشرقی اور مغربی پاکستان کے
قومی، ادبی اور تہذیبی رشتوں کے نام

"مطالعہ – کتنا ہی وسیع ہو مشاہدے
اور زندگی کی جد و جہد میں شریک ہو کر
تجربے حاصل کرنے کا بدل نہیں ہو سکتا"

(احتشام حسین)

کانڈاری ہوشیار!

(مانجھی)

نہ طے ہونے والے راستے، مسرود پہاڑیاں اور متلاطم سمندر
رات کی تاریکی میں تمہیں ان سبھوں سے گذرنا ہوگا مُسافر — ہوشیار!
ناؤ ڈگمگا رہی ہے، موجوں میں تلاطم ہے،
مانجھی راستہ بھول رہا ہے
بادبان کی دھجیاں اُڑ چکی ہیں،
کس کی ہمت ہے کہ آگر پتوار پکڑے
مستقبل پرچخ رہا ہے۔ کوئی جوان ہے۔ آئے آگے اور بڑھے
اور اس طوفان کی ہولنا کیوں میں
کشتی کو پار لگائے
ماں کی آزادی کی قسم کھانے والو! رات کی تاریکی سے ہوشیار

تمنائیں،
صدیوں کی جکڑی ہوئی حسرتیں
آج بندھنوں کو توڑنے کے لئے بے تاب ہیں
مایوس سینوں میں نفرت کی آندھیاں
انگڑائی لے رہی ہیں۔
مانجھی! تجھے سبھی کی رہبری کرنی ہوگی اور انہیں
اُن کا حق دلانا ہوگا۔
بے آس قوم ڈوب رہی ہے۔ یہ تیرنا نہیں جانتی
مانجھی! تو نے ماں کو آزاد کرانے کی قسم کھائی تھی
آج ہم اس کا امتحان لینا چاہتے ہیں
"ہندو نہیں وہ مسلمان ہے" کون نالائق یہ سوال اُٹھا رہا ہے
مانجھی! بول انسان ڈوب رہے ہیں انسان!
ایک ہی ماں کی اولاد۔

قاضی نذرالاسلام

کراچی

جمعرات —— ۱۵ جون

رات کے سوا گیارہ بجے ہیں۔ کراچی کا ہوائی مستقر روشنیوں میں جگمگا رہا ہے۔ ہم پانچ مدیر و صحافی۔ (مولانا رازق الخیری، مدیر عصمت کراچی، شریف المجاہد، صدر شعبۂ صحافت کراچی یونیورسٹی۔ قیوم ملک۔ مدیر انٹرپرائز کراچی۔ ذاکر علی نمائندہ تعمیر، راولپنڈی۔ اور صہبا لکھنوی۔ مدیر افکار، کراچی) اپنے بیگ لئے پی۔ آئی۔ اے کے اعلان کا انتظار کر رہے ہیں اور اعلان ہوتے ہی ایک قطار میں روانہ ہو کر سپر کانسٹیلیشن کی سیڑھیوں تک پہنچتے ہیں جہاں

پیا کی ایر ہوسٹس اور دیگر عملہ خندہ پیشانی سے مسافروں کا استقبال کرتا ہے اور مقررہ نشستوں کی رہبری کرتا ہے۔ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد ہر مسافر کو اپنی نشست مل جاتی ہے، اور تمام مسافروں کے بیٹھ جانے کے بعد جہاز کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ ہوائی جہاز کے طاقتور پنکھے پوری رفتار سے حرکت میں ہیں۔ یکایک روشنیاں گل ہو جاتی ہیں اور پہلے انگریزی میں — پھر اردو میں اعلان ہوتا ہے:۔

خواتین و حضرات!

ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بجے ہیں۔ اب ہم ڈھاکہ کیلئے پرواز کر رہے ہیں۔ براہ کرم سگریٹ بجھا دیجئے اور اپنی سیٹ بیلٹس باندھ لیجئے۔ اس جہاز کے کپتان خواجہ ہیں۔ ہم ۲۸۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے تقریباً ۱۱ ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرینگے اور حیدرآباد (سندھ) جودھپور، جے پور، گوالیار، الہ آباد، بنارس، گیا اور بہرام پور سے گذرتے ہوئے علی الصبح ڈھاکہ پہنچیں گے۔

اس اعلان کے ساتھ جہاز حرکت کرتا ہے اور ہوائی اڈے کے "رن وے" پر بھاگنے لگتا ہے اور دو تین چکر لگانے کے بعد آہستہ آہستہ بلند ہو جاتا ہے۔ اس اُڑان پر دل کی دھڑکن تیز ہونے اور قدرے گھبراہٹ کا جو احساس مجھے ہے ۔ وہی کچھ مولانا خیری اور ذاکر علی کو بھی ہے۔ ہم تین اتفاق سے برابر کی نشستوں پر ہیں اس لئے چہروں سے دلوں کا حال معلوم کر لینا مشکل نہیں۔

جہاز کے بلند ہوتے ہی پیٹیاں کھل جاتی ہیں۔ ایرہوسٹس تواضع کے لئے آجاتی ہے۔ سگریٹ سُلگ رہے ہیں اور ہر مسافر کے چہرے پر سکون کے آثار نمایاں ہیں۔ مولانا خیری کھڑکی کی طرف ہیں۔ اُن کے پاس ذاکر علی بیٹھے ہیں۔ درمیان کا راستہ چھوڑ کر میری نشست ہے۔ شریف المجاہد اور قیوم ملک اگلی نشستوں پر ہیں اور جہاز کی مستقل گھڑگھڑاہٹ میں ہماری آواز بھی ان تک نہیں پہنچ سکتی ہے۔

جہاز رفتہ رفتہ بلند ہو کر تیز رفتاری سے منزل کی طرف پرواز کر رہا ہے۔ ہمارا مختصر سا کارواں اگرچہ اپنے ہی خطۂ ملک۔ مشرقی پاکستان جا رہا ہے۔ لیکن سفر کی نوعیت اور مغربی و مشرقی پاکستان کے درمیان تقریباً ۱۴ سو میل کے فاصلے کو دیکھتے ہوئے

کچھ یوں لگتا ہے جیسے ہم لوگ دور دراز ملکوں کے سفر پر جا رہے ہیں۔

ہمارے اس دورے کو ادیبوں اور صحافیوں کے تبادلے کے پروگرام کے تحت ادارۂ تعمیر نو اور محکمۂ اطلاعات عامہ نے مشترکہ طور پر ترتیب دیا تھا اور مقصد یہ تھا کہ ہم مشرقی پاکستان کے حالات اور مسائل کا جائزہ لے سکیں اور ہمیں وہاں کے عوام، ادیبوں اور صحافیوں سے ربط و تعلق اور تبادلۂ خیالات کا موقع مل سکے۔ ہم پانچوں پہلی بار مشرقی پاکستان جا رہے تھے اور ہم میں سے ہر شخص کی یہی خواہش تھی کہ کم سے کم وقت میں مشرقی پاکستان کے زیادہ سے زیادہ شہروں، دیہاتوں اور دور دراز علاقوں کو دیکھ لیں۔

ذاکر علی پیا کے مطبوعہ لٹریچر کی زبان میں جو ہر نشست کے مقابل ہی دستیاب تھے اس وقت "متلائی کیفیت"[1] سے دوچار ہو گئے تھے۔ چنانچہ ہم نے فوراً ایر ہوسٹس کو متوجہ کیا اور وہ اُن کے لئے "سامانِ راحت" یعنی متلی کی دوا لے آئیں اور رفتہ رفتہ اُنکی طبیعت سنبھل گئی پھر وہ نماز پڑھنے چلے گئے اور میں انکی نشست پر آگیا

---

[1] تعجب نہ کیجئے۔ اس ترکیب کی ایجاد کا سہرا پیا کے سر ہے جب کبھی آپ ہوائی سفر کریں تو پیا کے مطبوعہ لٹریچر بعنوان "سفر راحت اثر" کے مطالعہ سے محروم نہ رہیں۔

مولانا خیری نے کہا۔ صہبا صاحب خوب سانحہ ہوا۔ اور میں نے کہا صاحب نہ آپ انجمن ادبی رسائل کی بنیاد رکھتے نہ ادبی رسالوں کے مدیروں کو کوئی پوچھتا۔ بہرحال خوشی کی بات ہے کہ آپ کی کوششیں بارآور رہیں۔

اسی دوران میں قیوم ملک اور شریف المجاہد ہمارے قریب آگئے اور ادہر ادُھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر کافی آگئی اور وہ دونوں اپنی نشستوں پر چلے گئے۔ اس عرصے میں ذاکر علی نماز پڑھ کر آگئے اب وہ ہشاش بشاش نظر آرہے تھے۔ کافی کے بعد سگریٹ کے پیکٹ آگئے اور ذاکر علی کے ماسوا ہر ایک نے دو دو پیکٹ خرید لئے۔ بعد میں۔ میں نے مولانا کے لئے ذاکر علی کے توسط سے دو پیکٹ اور خرید گئے۔ مولانا ضرورت سے کچھ زیادہ ہی سگریٹ پیتے ہیں لیکن رات کے اس طویل سفر میں کافی، سگریٹ اور باتوں کے سوا وقت گذاری کا کوئی اور مشغلہ بھی تو نہیں۔

پیا کے پاس جتنا کچھ اردو، انگریزی لٹریچر تھا۔ جستہ جستہ دیکھ لیا تھا۔ یہاں بھی انگریزی رسالوں کا بول بالا ہے۔ اکا دُکا اردو کے اچھے رسالے ہماری نظر سے گذرے۔ پی آئی اے پاکستان کی مایۂ ناز قومی سروس ہے۔ کاش وہ قومی زبان و ادب کی اہمیت بھی محسوس کرلے اور اردو، بنگلہ کے علاوہ دوسری علاقائی زبانوں

کا لٹریچر بھی ہوائی سردسوں میں مطالعہ کے لئے فراہم کرتی ہے کم سے کم اندرونِ ملک ہوائی سردسوں میں اس کا لبطورِ خاص انتظام ہونا چاہیئے۔

گھڑی دیکھی تو معلوم ہوا رات کے ۳ بج چکے ہیں۔ تین چار گھنٹے کس آسانی سے گذر گئے۔ احساس تک نہ ہوا۔ آنکھیں بوجھل ہورہی تھیں۔ لیکن نیند کا کوسوں پتہ نہ تھا۔ بیا کی نشستیں آرام دہ ہونے کے باوجود۔ گھر کی سی راحت و آسودگی کا بدل نہیں ہوسکتیں۔ مولانا پر بھی غنودگی طاری تھی اور ذاکر علی بھی تکیہ کا سہارا لے کر نیم دراز تھے۔ جہاز کا تقریباً ہر مسافر اپنی اپنی نشست پر نیند میں چور اور نیم خوابی کے عالم میں دراز تھا۔ برائے نام کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی۔ باتوں کا سلسلہ ٹوٹ چکا تھا اور میرے ذہن میں خیالات کے طویل سلسلے پھیل گئے تھے۔

یہ رات ۔۔ اب گھوم کر ماضی کے دریچوں سے جھانکتا ہوں تو کتنی انقلاب پرور نظر آتی ہے۔ مشرقی پاکستان کو قریب سے دیکھنے اور وہاں کے ان گنت انکار دوستوں سے ملنے کی مجھے کتنی تمنا تھی۔ ۱۲ سال اس تمنا کی تکمیل میں صرف ہوئے۔ میں نے سوچا یہ فاصلے ۔۔ یہ دوری اگر حائل نہ ہوتی تو پاکستان کے یہ دونوں

بازو کتنے طاقتور ہو سکتے تھے۔ کون نہیں جانتا کہ پاکستان کے قیام اور حصول آزادی میں بنگال کے سپوتوں نے کیا کچھ قربانیاں نہیں دیں۔ اسلام کے فروغ کے لئے مسلم حکمرانوں، صوفیاؤں اور روحانی پیشواؤں نے صدیوں پہلے جس عمارت کی بنیاد رکھی تھی۔ بالآخر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو وہ پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی۔ متحدہ ہندوستان میں بنگال ہی وہ پہلا صوبہ تھا جس نے سب سے پہلے قائد اعظمؒ کی آواز پر لبیک کہا تھا۔ ۱۹۰۶ء کے تاریخی فیصلے کو کون جھٹلا سکتا ہے؟ تاریخ ایک صداقت ہے۔ ایک سچائی ہے۔ اس کا سلسلہ ماضی میں بھی ہے۔ حال میں بھی ہے اور مستقبل بھی اسی کا رہین منت رہے گا۔

رات کچھ اور گہری ہو گئی ہے۔ جہاز پوری رفتار سے پرواز کر رہا ہے اور اس کے طاقتور پنکھوں کی مسلسل آواز انسان کی فکری بلندیوں کی نشاندہی کر رہی ہے۔ انسان جو پہلے چاند ستاروں کی داستانیں سنا کرتا تھا آج ارتقائی منزلوں میں پہنچ چکا ہے اور کوئی دن جاتا ہے۔ جب دنیا کے رہنے والے چاند ستاروں پر پہنچ کر تسخیر کائنات کے باب سے نئی دنیا کی نئی تاریخ مرتب کریں گے۔

اس سفر کے لذت آمیز کرب کو سدا یاد رکھنے کے لئے میں نے پھر کافی منگوالی ہے۔ میرے قریب ہی فلائٹ انجینیر مسٹر اشرف کھڑے ہیں چنانچہ وقت گذاری کے لئے میں نے انھیں متوجہ کیا اور جہاز کے بارے میں چند سوالات پوچھ لئے۔ میری دلچسپی کو دیکھتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ اس جہاز پر کیپٹن خواجہ کے علاوہ فرسٹ آفیسر مسٹر حنیف، چیک پرسر مسٹر رب۔ وہ خود بحیثیت فلائٹ انجینیر۔ پرسل مسٹر ضیاء الہدیٰ۔ ہوسٹس ڈان ندینہ عالم۔ اور اسٹوارٹ مسٹر شاہ سفر کر رہے ہیں، یہ سپر کانسٹیلیشن سی ٹائپ ہے۔ اس جہاز کے ٹورسٹ کلاس میں ۵۴ افراد اور ۲ بچے ہیں اور فرسٹ کلاس میں ۱۵ جگہیں ہیں۔ لیکن اس سفر میں صرف ۸ مسافر ہیں۔ راستے کے بارے میں دریافت کرنے پر مسٹر اشرف ایک نقشہ لے آئے اور نقشہ کی مدد سے مجھے ہوائی راستوں کے بارے میں سمجھانے لگے۔ میں ایک طالب علم کی طرح نقشہ کی تفصیلات [illegible]تا رہا۔ اسی دوران میں جہاز کی کھڑکیوں سے نیچے سوئی ہوئی زمین پر یکایک روشنیوں کا ایک ہجوم نظر آیا تو مسٹر اشرف نے اپنی گھڑی دیکھ کر مجھے بتایا کہ اب ہم بنارس سے گذر رہے ہیں۔ بنارس کا نام آتے ہی میرے ذہن میں ۲۵ سال قبل کا

وہ زمانہ گھوم گیا جب میں طالب علمی کے زمانے میں امیر الدولہ اسلامیہ کالج کی ہاکی ٹیم کے ساتھ بنارس گیا تھا اور ایک صبح۔ صبح بنارس، دیکھنے ۔گھاٹ پر پہنچا تھا۔ پھر میں نے اورنگ زیب کی اس مسجد کو بھی دیکھا تھا جو گھاٹ کے کنارے ویران اور اجاڑ پڑی تھی۔ نہ وہاں کوئی نماز پڑھتا تھا نہ اس کے میناروں سے صدائے اللہ اکبر سنائی دیتی تھی۔ تاریخ نے کیسے کیسے نقش ابھارے ہیں اور کیسے کیسے نقش مٹائے ہیں۔ آن آن کی روشنیاں زمین کے اندھیروں میں ڈوب گئیں اور جب مسٹر اشرف نے پھر میری توجہ نقشہ کی طرف مبذول کرائی تو میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ انھوں نے بتایا کہ ہوائی معاہدہ کے تحت ہم بھارت کی سرحدوں سے گذرتے ہیں۔ جہاز ایک مقررہ بلندی پر پرواز کرتا ہے۔ طوفان کی صورت میں اوپر نیچے اڑان کی جاتی ہے۔ تاکہ جہاز طوفان میں نہ پھنس جائے۔ ایک انجن خراب ہو جانے کی صورت میں دوسرا انجن کام کرتا ہے۔ پرواز کے دوران بہت کم حادثے ہوتے ہیں۔ البتہ اڑان کے وقت اور اترتے وقت بڑی احتیاط کی جاتی ہے۔ اکثر حادثے ایسے ہی مواقع پر ہوئے

تھا۔ لیکن یہ جیٹ ایج ہے۔ ہوائی سفر تیز رفتار ہی نہیں محفوظ اور آرام دہ بھی ہے ۔۔۔ پاکستان میں جیٹ سروس[1] شروع ہونے کے بعد ۱۲۰۰ سو میل کا سفر دو ڈھائی گھنٹے میں طے ہو سکے گا۔

مسٹر اشرف نے میرے لئے پھر کافی منگوائی ہے۔ کافی کے بعد ان کی ہدایت پر ڈان ٹریبیونہ عالم سگریٹ کے پیکیٹ بھی لے آئیں۔ اس دوران میں مولانا خیری بھی جاگ اٹھے تھے اور اس گفتگو میں دلچسپی لے رہے تھے۔ ہوائی جہاز میں سگریٹ سستے ملتے ہیں۔ چنانچہ مسٹر اشرف نے بطور خاص مولانا کو اور مجھے دو دو پیکیٹ مزید دیئے۔ جس کی ہم نے قیمت ادا کر دی۔

اب جہاز میں بیداری کے آثار نمایاں ہیں کوئی کھانس رہا ہے، کوئی جمائیاں لے رہا ہے۔ شریف المجاہد اور قیوم ملک کسی اہم مسئلہ پر محو گفتگو ہیں ذاکر علی بھی جاگ اٹھے ہیں۔ مسٹر

---

[1] ۱۹۶۲ء سے بوئنگ ۷۰۷ کی سروس پیا نے شروع کر دی ہے اور توقعات کے مطابق اس سروس میں جلد اضافہ ہو جائے گا۔

اشرف ہم سے کہہ کر کسی کام سے اندر گئے۔ تھوڑی دیر بعد ڈان زرینہ عالم اور جہانہ کے کارکن ناشتہ لے آئے۔ جب ڈان زرینہ عالم میرے پاس ناشتہ لے کر آئیں تو نجانے کیوں میں نے ان سے پوچھ لیا۔

"آپ کا نام ڈان زرینہ عالم ہے نا!"

وہ اس سوال پر کچھ حیران سی ہو کر بولیں۔

"جی ہاں"

"زرینہ عالم تو سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن 'ڈان' سے کیا مطلب ہے؟

میں نے پھر سوال کیا۔

انھوں نے میرا سوال سنا اور نہایت سادگی سے جواب دیا۔

"ڈان، کے معنیٰ صبح کے ہیں۔ وہ بڑی خوبصورتی سے ٹال گئیں۔

میں اس جواب پر لاجواب ہو گیا مولانا اس سوال وجواب پر صرف مسکرا کر رہ گئے۔

اسی وقت مسٹر اشرف آ گئے اور انھوں نے بتایا کہ اس وقت صبح کے پانچ بج رہے ہیں۔ اب ہمارا سفر ایک گھنٹے سے بھی کم رہ گیا ہے۔ مشرقی پاکستان کا وقت

مغربی پاکستان کے وقت سے ایک گھنٹہ آگے ہے۔ اس لئے ہم تقریباً ۶ بجے تک ڈھاکہ پہنچ جائیں گے۔

جہاز میں زندگی کی ہماہمی پیدا ہو گئی ہے اور جہاز کی کھڑکیوں سے صاف نظر آرہا تھا کہ رات کا اندھیرا چھٹ رہا ہے اور صبح کا اُجالا پھیل رہا ہے۔ رات جو خواب کی پریوں کی طرح ہماری شریک سفر تھی۔ اب ہم سے رخصت ہو رہی تھی۔

ہمارا قافلہ بظاہر مختصر ہے لیکن ہم مغربی پاکستان کے رہنے والے بہترین جذباتِ خیرسگالی کے ساتھ سرزمین مشرقی پاکستان کو بوسہ دینے کے آرزومند ہیں۔ فاصلے کے باوجود ہمارے دلوں کے رشتے اُخوت اور محبت کے رشتے، قومی وحدت اور تہذیب و ثقافت کے رشتے اتنے مضبوط اور مستحکم ہیں کہ دوری اور بُعد کسی طور ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتے۔ دراصل مملکت پاکستان کا قیام و وجود ہی ان دونوں بازوؤں کی مشترکہ طاقت و توانائی کا رہینِ منت ہے۔

مسلسل سوا چھ گھنٹے کی پرواز کے بعد ہم سب اُس اعلان پر متوجہ ہو گئے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ

ہماری منزل قریب آ گئی ہے۔ براہ کرم سگریٹ بجھا دیجئے اور اپنی پیٹیاں باندھ لیجئے، ہم تیج گاؤں کے ہوائی اڈے پر اتر رہے ہیں اور جس وقت ہمارے جہاز نے سرزمین پاکستان پر قدم رکھا ہے۔ اس وقت ڈھاکہ کے وقت کے مطابق چھ بجنے میں دس منٹ تھے۔

ڈھاکہ

جمعہ ــــــ ۱۶ جون

جہاز کا دروازہ کھُلتے ہی مسافروں نے اپنے بیگ اور تھیلے سنبھال لئے اور ایک قطار کی صورت میں سیڑھیوں سے اُترنے لگے۔ مولانا خیری مجھ سے آگے تھے۔ میرے پیچھے ذاکر علی اور چند مسافروں کو چھوڑ کر قیوم ملک اور شریف المجاہد تھے۔ سیڑھیوں سے اُترتے ہی تین حضرات ہمارے پاس آئے اور آگے بڑھ کر اُن میں سے ایک صاحب نے دریافت کیا۔

"آپ لوگ مغربی پاکستان کے جرنلسٹ ہیں؟" میں نے اثبات میں جواب دیا تو ایک دبلے پتلے، پستہ قد کے نوجوان نے

آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا اور اپنا تعارف کرایا۔

"مجھے افضل حسین کہتے ہیں۔ پریس انفارمیشن کی طرف سے آپ لوگوں کو ریسیو کرنے آیا ہوں۔ یہ مسٹر رستم علی ہیں، ہمارے انفارمیشن آفیسر اور یہ مسٹر سعید الرحمٰن ــ پریس فوٹو گرافر۔"

اس دوران میں شریف المجاہد اور قیوم ملک بھی پہنچ گئے ایک دوسرے سے متعارف ہونے کے بعد افضل حسین کی خواہش پر ہم پانچوں لائن میں کھڑے ہو گئے اور پیا کے پس منظر میں ہمارا گروپ فوٹو لیا گیا۔ اس کے بعد سامان کے انتظار میں کچھ دیر ہوائی اڈے پر ٹھہرے۔ ٹکٹ اور رسیدیں چیک ہونے کے بعد افضل حسین نے سامان اٹھوایا اور ہم لوگ ہوائی اڈے سے باہر آگئے جہاں سرکاری موٹریں ہمارے انتظار میں کھڑی تھیں۔ سامان سمیت ہم لوگ ڈھاکہ کی شاہراہوں سے گذرتے ہوئے ہوٹل شاہ باغ پہنچے جہاں ہمارے قیام کا پہلے سے انتظام تھا۔ رستم علی نے بتایا کہ ہوٹل شاہ باغ ڈھاکہ ہی نہیں مشرقی پاکستان کا سب سے بڑا اور آرام دہ ہوٹل ہے۔ آپ لوگوں کو یہاں کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی۔ اب آپ حضرات مشرقی پاکستان کی حکومت کے مہمان ہیں۔ پھر انھوں نے افضل حسین اور سعید الرحمٰن

کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ دونوں آپ کے ساتھ دورے میں رہیں گے۔ میں بھی خدمت کے لئے یہاں موجود ہوں۔ آپ حضرات نہا دھو کر تیار ہو جائیں۔ ناشتے کے بعد سکرٹریٹ چلیں گے۔ یہ کہہ کر وہ تینوں رخصت ہو گئے۔

قیام کی صورت یہ ہوئی کہ مولانا اور میں دوسری منزل کے ایک کمرے میں ٹھہرے۔ قیوم ملک اور شریف المجاہد کو تیسری منزل میں کمرہ ملا اور ذاکر علی ایک سنگل کمرے میں تنہا مقیم ہوئے۔ ہماری خواہش اور کوشش کے باوجود ایک ہی منزل میں سب کا قیام ممکن نہ ہو سکا کیونکہ کمرے خالی نہ تھے۔

ضروریات سے فراغت کے بعد ہم پہلی منزل کے وسیع و عریض ڈائننگ ہال میں ناشتہ کے لئے پہنچے۔ ابھی ہم ناشتہ ہی کر رہے تھے کہ ہمیں ڈائننگ ہال کے قد آدم شیشے کے دروازوں پر تیزی سے چلتے ہوئے افضل حسین نظر آئے۔ اور یکایک دروازے سے ان کا سر ٹکرا گیا۔ بدحواسی میں انھیں شیشے کا دروازہ کھولنے کا خیال نہ رہا تھا۔ شیشے کافی مضبوط تھے۔ ان پر تو کچھ اثر نہ ہوا۔ البتہ افضل حسین کے سر میں خاصی چوٹ آگئی۔ فوراً گرم پانی منگوایا گیا اور پیشانی کی چوٹ کو رومال

بھگو کر سینکا گیا۔ ہم سب کو افسوس تھا۔ لیکن افضل حسین یہی کہتے رہے۔ کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں۔

اس دوران میں رستم علی بھی آ گئے اور ہم لوگ سکریٹریٹ کے لئے روانہ ہوئے۔ موسیٰ احمد صاحب سکریٹری انفرمیشن نہایت خندہ پیشانی سے ملے۔ کوئی دو گھنٹے ہم اُن سے مختلف مسائل پر گفت گو کرتے رہے۔ ہماری عدم موجودگی میں پندرہ دن کے دورے کا جو پروگرام ترتیب دیا گیا تھا وہ کئی لحاظ سے ترمیم طلب تھا۔ ہم میں سے ہر شخص کی یہ خواہش تھی کہ مشرقی پاکستان کے زیادہ سے زیادہ علاقوں کو کم سے کم وقت میں دیکھ لیں تاکہ اس خطۂ ملک کے مسائل و حالات، صنعتوں اور کارخانوں عوام کے معیار زندگی اور ان کی مشکلات کا بخوبی اندازہ ہو سکے۔ ابتدائی پروگرام میں بار بار ڈھاکہ کا قیام تھا جو صرف ہماری سہولت اور آرام و آسائش کے پیش نظر ضروری سمجھا گیا تھا۔ ہم نے اسی بھی تبدیل کرنے پر اصرار کیا اور لگاتار سفر کرنا پسند کیا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ہم پانچوں پہلی بار مشرقی پاکستان آئے تھے اور ہم میں سے ہر ایک تجربے اور مشاہدے کا جویا تھا۔ موسیٰ احمد صاحب نے ہمارے پرخلوص جذبے کی قدر

کرتے ہوئے پروگرام از سرِ نو ترتیب دیا اور فوری ہدایات جاری کر دیں۔ چائے کیک پیسٹری کی تواضع کے بعد ہم صادق الرحمٰن صاحب ڈپٹی ڈائرکٹر انفرمیشن سے ملنے گئے۔ وہ بھی نہایت محبت سے ملے۔ رستم علی اور افضل حسین ہمارے ہمراہ تھے۔ وہاں سے ہو کر سکرٹریٹ کی عالیشان بلڈنگ (جو ایڈن بلڈنگ کہلاتی ہے) کے کمروں کے طویل سلسلوں کو طے کرتے ہوئے واپس ہو رہے تھے کہ احسن احمد اشک مل گئے۔ ہر ایک سے گرمجوشی کے ساتھ مصافحہ کیا اور ہمارے ساتھ ہو لئے۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد مولانا خیری اپنے ایک عزیز صدیقی صاحب کی تلاش میں نکلے۔ قیوم ملک اور شریف المجاہد ہوٹل لوٹ گئے۔ مجھے مولانا نے اپنے ساتھ رکھا۔ کچھ دیر کی تلاش کے بعد ہم صدیقی صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ مولانا ان کے گھر والوں سے مل آئے۔ صدیقی صاحب نہ مل سکے۔ وہاں سے ہوٹل واپس آئے۔ جمعہ کی نماز ادا کی۔ کھانے کے بعد ۳ بجے کے قریب ڈھاکہ کے صنعتی اور مشہور مقامات دیکھنے کا پروگرام تھا۔ اس دوران میں صلاح الدین محمد ہوٹل شاہ باغ آ گئے۔ وہیں سے میں نے وحید قیصر ندوی، مسرور بارہ بنکوی، اختر پیامی اور ڈھاکہ کے دوسرے احباب کو فون کیا۔ صلاح الدین محمد

کچھ اس طرح آکر ملے جیسے برسوں کی جان پہچان ہو۔ ان کی قربت اور معیت سے ہمیں بڑی سہولت اور تقویت رہی۔ کچھ دیر بعد ہم لوگ دو کاروں میں ڈھاکہ کے خاص خاص مقامات دیکھنے کیلئے روانہ ہوئے۔ رستم علی۔ افضل حسین، شریف المجاہد اور ذاکر علی ایک کار میں، دوسری میں صلاح الدین محمد، قیوم ملک، مولانا اور میں۔

اب ڈھاکہ تاریخ کی ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح ہمارے سامنے تھا۔ شہر کی مختلف شاہراہوں سے گذرتے ہوئے ہمیں اس شہر کی عظمت و قدامت، مغل طرز تعمیر اور تین صدیوں کے انقلابی ادوار کا تجزیہ کرنے میں زیادہ دقت نہ ہوئی۔ پھر قدیم ڈھاکہ کے ساتھ ساتھ جدید ڈھاکہ کے تعمیری نمونے، وسیع شاہراہیں، نئی بستیاں جن میں محمد پور بطور خاص قابل ذکر ہے۔ ہمارے سامنے تھا۔ ڈھاکہ کتنا قدیم ہے؟ ۔ مورخین میں اس بات پر اختلاف ہے۔ لیکن تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ ہندوؤں کے دور حکومت میں بھی اور بنگال کے سلاطین کے عہد میں بھی یہ شہر ترقی یافتہ تھا۔ لیکن اس کی صحیح اہمیت و عظمت کا آغاز ۱۶۰۸ء میں ہوا جبکہ مغلوں نے اسے صوبائی صدر مقام بنا لیا۔ اسی زمانے سے اس شہر کی شہرت میں اضافہ ہوا۔ ڈھاکہ کی ململ مشرق و مغرب کے

سلاطین کا ہمیشہ پسندیدہ لباس رہا اور آج بھی مشہور زمانہ ہے
گذشتہ تین صدیوں سے ڈھاکہ صدر مقام کی حیثیت سے
برابر ترقی کر رہا ہے۔ قلعۂ اورنگ آباد جو عام طور پر قلعۂ
لال باغ کے نام سے مشہور ہے ڈھاکہ کی قدیم ترین عمارتوں
میں سے ہے اور فن تعمیر کا نادر نمونہ۔ اس قلعہ کو سترہویں صدی
کے آخر میں اورنگ زیب کے بیٹے شہزادہ محمد اعظم نے تعمیر کرایا
تھا۔ یہیں بی بی پری کا مقبرہ ہے جو نواب شائستہ خاں کی بیٹی تھی
اور ایران دخت کے نام سے مشہور تھی۔ اس کے علاوہ چوک مسجد،
حسینی دالان کا امام باڑہ جسے سید مراد نے تعمیر کرایا تھا۔ بڑا کٹرہ اور
چھوٹا کٹرہ جو بوڑھی گنگا کے کنارے واقع ہے اور ڈھاکہ کی ہر گلی
ہر سڑک اور ہر شاہراہ پر قدیم مسجدوں کے طویل سلسلے اس شہر کی تاریخی
شان و عظمت کی گواہی دے رہے تھے۔ ڈھاکہ صرف مسلم تہذیب
و ثقافت ہی کا آئینہ دار نہیں بلکہ یہاں ہندو، سکھ اور عیسائی مذہب
کے علمبرداروں کی یادگاریں بھی تاریخی حیثیت رکھتی ہیں، مشہور
جے کالی کے مندر کے علاوہ ان گنت دوسرے مندر اور گرجے
بزبان حال سے اپنی قدامت اور مشترکہ تہذیبی ورثے کی داستان
سنا رہے تھے۔ ڈھاکہ میں آج بھی تمام مذاہب کے لوگ دوش

بدوش اور شادمان بشاشت نہ صرف زندگی کی جد وجہد میں حصہ لے رہیں بلکہ نہایت مطمئن زندگی بسر کر رہے ہیں۔

ڈھاکہ کے گلی کوچوں، تنگ و کشادہ سڑکوں اور وسیع و عریض شاہراہوں سے گذرتے ہوئے ہم لوگ پنج گاؤں کے صنعتی علاقے میں پہنچے جہاں ملوں اور فیکٹریوں کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ اس علاقہ کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے ہمیں احساس ہوا کہ ڈھاکہ کی صنعتی ترقی کے ابھی وسیع امکانات ہیں اور ڈھاکہ میں جس تیز رفتاری سے تعمیری کام ہو رہا ہے اسکو دیکھتے ہوئے یہ توقع بے جا نہیں کہ جلد ہی ڈھاکہ ایک بڑا صنعتی مرکز بن جائے گا۔
واپسی میں ہمیں پاکستان گیر شہرت رکھنے والی کوہ نور کیمیکل کمپنی اور حبیب پیچ انڈسٹری نظر آئی۔ پھر ہم گنجان علاقوں سے گذر کر صدر گھاٹ پر اُترے۔ صلاح الدین محمد میرے ساتھ تھے۔ گھاٹ پر بڑی رونق اور چہل پہل تھی۔ دریا کے کنارے چھوٹی بڑی کشتیوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ صلاح الدین محمد اور میں باتیں کرتے ہوئے ساحل پر دور تک نکل گئے۔ صدر گھاٹ دراصل یہاں کا ایک بڑا بازار بھی ہے اور یہاں اشیاء ضروریات نسبتاً سستی مل جاتی ہیں۔ ساحل پر مردوں عورتوں اور بچوں کی ہر وقت بھیڑ لگی رہتی ہے۔ پھلوں اور ترکاریوں

کے ڈھیر اور خریداروں کی بھیڑ سے میلہ کا سا سماں نظر آتا ہے۔ اسی گھاٹ سے کچھ دور نوابین ڈھاکہ کی تاریخی عمارات کے دھندلے نقوش نظر آ رہے تھے۔ انھیں عمارات میں مشہور تاریخی عمارت "حسن منزل" بھی تھی۔ جہاں ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کی بنیاد پڑی تھی۔ اور بنگال کے جیالے سپوتوں نے قیام پاکستان اور جد و جہد آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ لیکن یہ بات ہم میں سے بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔

اس وقت پانچ بج رہے تھے۔ ساڑھے پانچ بجے تک پروگرام کے مطابق ہمیں پریس کلب پہنچنا تھا۔ جہاں مقامی صحافیوں نے ہمارے اعزاز میں عصرانہ ترتیب دیا تھا۔ چنانچہ صدر گھاٹ سے روانہ ہو کر ہم سیدھے پریس کلب پہنچے۔ پریس کلب میں وحید قیصر مذوی، اختر پیامی اور دوسرے رفیقوں سے ملاقات ہوگئی، موسیٰ احمد صاحب بھی تشریف لے آئے اور پریس کلب کے ہال میں صلاح الدین محمد، صدر جرنلسٹ ایسوسی ایشن نے ہمارا فرداً فرداً تعارف کراتے ہوئے مشرقی پاکستان میں ہماری آمد پر دلی مسرت کا اظہار کیا ہماری نمائندگی مولانا رازق الخیری نے فرمائی اور سب کی جانب سے بہترین جذبات خیر سگالی کا اظہار فرمایا۔ ذاکر علی۔ قیوم ملک اور

شریف المجاہد نے بھی مختصر تقریریں کیں۔ پھر صلاح الدین محمد نے "افکار" کا بطور خاص ذکر کیا اور یہ بتایا کہ افکار اردو کا پہلا رسالہ ہے جو ابتدا ہی سے بنگلہ ادب کے ترجمے اردو میں شائع کر کے اردو کے ساتھ ساتھ بنگلہ ادب کی بھی خدمت کر رہا ہے۔ صلاح الدین محمد کی خواہش پر میں نے بھی مختصراً اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اس بات پر زور دیا کہ اردو اور بنگلہ ہماری قومی زبانیں ہیں۔ اسلئے ضرورت ہے کہ ان زبانوں کو ترجمہ کے ذریعہ ایک دوسرے کے قریب لایا جائے۔

مشرقی پاکستان میرے خوابوں میں بستا تھا۔ ۱۲ سال سے میری تمنا تھی کہ اس خطۂ ملک کو قریب سے جا کر دیکھوں۔ ۱۲ سال بعد میری تمنا پوری ہو سکی —— افکار کے ذریعے یہاں کے ان گنت ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں سے قلمی رابطہ قائم تھا۔ آج ان دوستوں اور رفیقوں سے مل کر مجھے جو مسرت نصیب ہوئی ہے اس کا اظہار الفاظ میں ممکن نہیں۔

باتوں باتوں مغرب و مشرق کے درمیان بدگمانی اور غیر وفاداری کا ذکر بھی نکل آیا۔ لیکن جب ہم میں سے ہر ایک نے اس بات کا یقین دلایا کہ یہ غلط فہمی دراصل سیاست بازی کا نتیجہ ہے۔ ورنہ

مغربی پاکستان کے عوام مشرقی پاکستان کے عوام کے دکھ درد میں خود کو برابر کا شریک سمجھتے ہیں تو بات ختم ہو گئی۔

موسیٰ احمد صاحب نے بھی اس گفتگو میں حصہ لیا اور اس بات پر زور دیا کہ ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کے تبادلے بہت ضروری ہیں۔ دونوں بازوؤں کو قریب لانے اور ایک دوسرے کے مسائل کو سمجھنے اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کا یہی مؤثر ذریعہ ہیں۔ آخر میں صلاح الدین محمد نے کہا کہ جب آپ حضرات مشرقی پاکستان کے مختلف علاقوں کا دورہ کر کے واپس آئیں گے تو پھر ایک بار ہم آپ کو اظہار خیال کی زحمت دیں گے۔

تقریب ختم ہونے کے بعد عصرانہ شروع ہوا۔ پھر گروپ فوٹو لیا گیا۔ بعدہٗ ہم لوگ ہوٹل شاہ باغ واپس آ گئے۔

۹ بجے کے لگ بھگ کھانے سے فارغ ہوئے کچھ دیر بعد وحید قیصر ندوی، صلاح الدین محمد، سرور بارہ بنکوی، اختر لکھنوی اور پاک کتاب گھر کے نجم الحسن ملاقات کے لئے آئے، دو ڈھائی گھنٹہ تک ادب اور ادیبوں کے مشترکہ مسائل، کتابوں کی نشر و اشاعت اور مشرقی و مغربی پاکستان کے عام حالات پر بات چیت ہوتی رہی۔ بارہ بجے کے قریب یہ حضرات رخصت ہوئے۔ چلتے

وقت صلاح الدین محمد نے بتایا کہ حنیف فوق، منظور احمد کے ساتھ لاہور گئے ہیں۔

اس عجیب اتفاق پر حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی ہوا حنیف فوق سے دیرینہ ربط و تعلق ہے۔ وہ ۴۵ء سے افکار میں لکھ رہے ہیں۔ ایک دوبارہ کراچی بھی آئے ہیں اور ہمیشہ ڈھاکہ آنے کی دعوت دے گئے ہیں۔ لیکن اس وقت جبکہ میں ڈھاکہ میں موجود ہوں تو وہ لاہور چلے گئے۔ اُن سے ملاقات نہ ہونے کا سخت افسوس رہا۔

نرائن گنج

ہفتہ — ۷ جون

پروگرام کے مطابق ۹ بجے کے قریب ہم دو موٹر کاروں میں نرائن گنج کے لئے روانہ ہوئے ڈھاکہ سے نرائن گنج فاصلہ ۱۲ میل ہے یہ شہر دریائے سیتالکھیا[1] پر واقع ہے اور مشرقی پاکستان کا مصروف ترین دریائی

---

[1] مشرقی پاکستان میں چاروں طرف چھوٹے بڑے دریاؤں کا جال سا بچھا ہوا ہے اور اس خطۂ ملک کی ہر جہتی ترقی میں ان دریاؤں کا بڑا حصہ ہے۔ سیتالکھیا کی لمبائی کوئی پچاس میل ہے۔ اس کا پانی صاف و شفاف ہے اور اس میں لوہا بھی بہت ہے آزادی کے بعد اس کے کناروں پر آبادی میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ یوں تو مشرقی پاکستان کے ہر دریا کی اپنی خصوصیات ہیں لیکن کرنافلی کے بعد سیتالکھیا سب سے اہم دریا ہے۔ اس دریا میں ہر موسم میں جہاز آتے جاتے ہیں اور نرائن گنج سے پٹ سن، سوتی کپڑا اور دیگر سامان لے جاتے ہیں۔

بندر گاہ ہے ڈھاکہ سے نرائن گنج تک سڑک نہایت صاف ستھری اور کشادہ ہے۔ دو رویہ کھیتوں اور تالابوں کے سلسلے پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ شہر ڈھاکہ کا سب ڈویژن ہے۔ یہاں پٹ سن، چاول، روئی اور انجنیئرنگ کے متعدد کارخانے ہیں۔ اس شہر کی آبادی ایک لاکھ سے زائد نفوس پر مشتمل ہے۔ مشرقی پاکستان کا ۹،۲۵،۰۰۰ ٹن سے زائد جوٹ یا اس کی تیار کردہ اشیاء کا پچاس فیصد حصہ تنہا نرائن گنج کی دریائی بندرگاہ سے چاٹگام اور چالنا کی ساحلی بندرگاہوں کو بھیجا جاتا ہے۔ جہاں سے یہ اشیاء بیرونی ملکوں کو برآمد کی جاتی ہیں۔ جوٹ بیلنگ، جوٹ شپنگ کے علاوہ جوٹ کے دیگر اہم کارخانے دریائے سیتا لکھیا کے دونوں کناروں پر واقع ہیں۔ اور اسی دریا کے دونوں کناروں پر دریائی بندرگاہ بھی ہیں جو نقل و حمل کا کام کرتے ہیں باتوں باتوں میں بارہ میل کا سفر ختم ہو گیا اور جب ہم لوگ آدم جی جوٹ ملز پہنچے ہیں تو وہاں ہمارا انتظار ہو رہا تھا۔ غلام حسین صاحب پی۔ آر۔ او (پبلک ریلیشن افسر) نے ہمارا خیر مقدم کیا اور ہمیں جوٹ مل دکھانے کے لئے ہمارے ساتھ ہو گئے۔

تقریباً دو گھنٹے ہم مل میں رہے اور کئی شعبوں کو ہم نے

دیکھا اور ہمیں یہ جان کر دلی مسرت ہوئی کہ یہ دنیا کا سب سے
بڑا جوٹ مل ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس مل پر دس کروڑ سے
زائد خرچ آیا ہے۔ مل کی تعمیر ۵۰ء میں شروع ہوئی تھی
جس کی تکمیل ۵۵ء میں ہوئی۔ اس مل میں ایک ارب بیس
کروڑ گز ٹاٹ اور ۶ کروڑ بوریاں سالانہ اور تقریباً ۳۶۰ ٹن
جوٹ کا سامان روزانہ تیار ہوتا ہے۔ یہ مل تین سو ایکڑ رقبے
میں پھیلا ہوا ہے۔ ایک وقت میں بیس، بائیس ہزار مزدور
کام کرتے ہیں، مزدوروں کی رہائش، طعام و آسائش کا مل کے
اندر ہی مکمل انتظام ہے، مکانات جو مل نے تعمیر کئے ہیں معمولی
کرایوں پر مزدوروں، کلرکوں اور افسروں کو مہیا کئے گئے ہیں۔
مل کے اندر چار پرائمری اسکول اور ایک ہائی اسکول قائم
ہے۔ دو کلب ہیں۔ ایک ٹی بی کلینک ہے۔ تعلیم اور علاج مفت
ہے، غریب بیوہ عورتوں کی رہائش کا علیحدہ انتظام ہے مل میں
کام کرنے والی عورتوں کے شیر خوار بچوں کی دیکھ بھال کے لئے ایک
علیحدہ ہال ہے۔ جہاں آیائیں اُن کی نگہداشت کرتی ہیں، اس
ہال کا نام "بے بی کریشنگ" ہے مل کی کینٹن سے کھانا تیار ملتا ہے
جسے مل کے مالکان اور مزدوروں کے نمائندے مشترکہ طور پر

چلاتے ہیں۔ اس مل کی سطح کو زمین سے ۹ فٹ اونچا کیا گیا ہے
تاکہ سیلابوں کا خطرہ نہ رہے۔ مل کے احاطے میں دو بڑے تالاب
ہیں جہاں نہانے اور کپڑے دھونے کی سہولت ہے۔ مل کے تین
کارخانوں میں اوقات کار کی تقسیم کے ساتھ مزدور کام کرتے ہیں
مل جدید ترین مشینوں سے آراستہ ہے اور طریق کار یہ
ہے کہ پہلے جوٹ کی دھنائی ہوتی ہے۔ پھر اُسے دھوتے ہیں
دھونے کے بعد تاگہ بنتا ہے اور تاگہ سے ٹاٹ تیار کرتے ہیں۔ پھر
ٹاٹ کو دوسری مشینوں کے ذریعہ مقررہ ناپ کے مطابق قطع کر لیا
جاتا ہے — اس سے بوریاں بنتی ہیں۔ ہم نے ایک مشین پر کافی
بڑی بوریاں بنتی دیکھیں۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ ایک بیرونی
ملک کے آرڈر پر بڑے سائز کی بوریاں بنائی جا رہی ہیں۔ جب
بوریاں تیار ہو جاتی ہیں تو خودکار مشینیں اُنھیں پیک کر کے جائے
مقصود پر خود پہنچا دیتی ہیں۔ یہاں مشینی زندگی کا دلچسپ مشاہدہ
ہوا جس سے ہم بھی مستفید ہوئے۔ پٹ سن کے سلسلے میں
پاکستان کو اولیت حاصل ہے۔ ویسے ہندوستان اور مصر
سے بھی اس کا مقابلہ ہے لیکن پاکستانی مال کی ہر جگہ مانگ ہے۔
مل دیکھنے کے بعد ایک خوبصورت بنگلہ میں — چائے

کیک، پیسٹری سے تواضع کی گئی۔ ہم نے غلام حسین صاحب سے مختلف
سوالات کیے اور یہ جان کر ہمیں حیرت ہوئی کہ اس مل میں نہ شوروم
ہے نہ شعبۂ نشر و اشاعت نہ مل کے بارے میں مطبوعہ لٹریچر صرف
ایک سائیکلو اسٹائل کیا ہوا صفحہ ہم میں سے ہر ایک کو دیا گیا تھا
جس میں برائے نام تفصیلات درج تھیں۔ اور جب غلام حسین
صاحب نے ہمیں بتایا کہ اس مل کی پبلسٹی پر ۲۷ لاکھ روپے سالانہ
خرچ ہوتا ہے تو ہمیں اور بھی تعجب ہوا۔

بلاشبہ آدم جی جوٹ مل دنیا کا سب سے بڑا مل ہے ضرورت
اس بات کی تھی کہ مل کے کارپردازان بیرونی ملکوں سے آنیوالے
حضرات کے لیے خوبصورت کتابچے اردو، بنگلہ اور انگریزی میں
تیار کر کے رکھتے۔ باقاعدہ شعبۂ نشر و اشاعت ہوتا، شوروم ہوتا
پبلسٹی کا واضح پروگرام بنایا جاتا تاکہ اندرون ملک اور بیرون ملک
مل کی قدر و اہمیت کا احساس پیدا ہوتا، ۲۷ لاکھ کہاں خرچ ہوتے
ہیں کس طرح خرچ ہوتے ہیں۔ ہمیں اس سے بحث نہیں۔ لیکن
اس بات پر دکھ ہوا کہ ہم نے اپنے ملک کی دولت کو خود ملک والوں
سے چھپا رکھا ہے اور جیسا کہ غلام حسین صاحب نے بتایا۔ مل
کو نشر و اشاعت کی اس لئے ضرورت نہیں کہ چھ چھ ماہ کے آرڈر

پہلے سے آچکے ہیں اور مال کی تیاری اور ترسیل مل کے اختیار سے باہر ہے۔ اس دلچسپ منطق پر صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے بیشتر صنعت کاروں نے دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ اور نشر و اشاعت کی قدر و قیمت پر توجہ دینے کی کبھی ضرورت نہیں سمجھی حالانکہ آج نشر و اشاعت سے ہی پاکستان کے مقابلے میں بہت چھوٹے ملکوں نے اپنی صنعتوں کے لئے بین الاقوامی منڈیاں پیدا کر لی ہیں۔ کاش ہمارے صنعت کار بھی اس طرف توجہ دینا پسند کریں۔

بارہ بج رہے تھے اور پروگرام کے مطابق ہمیں انسٹیٹیوٹ آف آرٹس پہنچنا تھا اس لئے غلام حسین صاحب کا شکریہ ادا کر کے نرائن گنج سے ڈھاکہ واپس ہوئے۔

انسٹیٹیوٹ آف آرٹس

ڈھاکہ میں فنون لطیفہ کا یہ ادارہ فن مصوری کی قدیم و جدید روایات کا علمبردار ہے مشہور مصور زین العابدین اس کے پرنسپل ہیں۔ انھیں کی نگرانی میں اس ادارہ کا قیام ۱۹۴۸ء میں عمل میں آیا تھا۔ جب ہم انسٹیٹیوٹ پہنچے تو پروفیسر امین الاسلام نے

ہمارا خیر مقدم کیا۔ زین العابدین سے ملاقات نہ ہو سکی۔ وہ لاہور گئے ہوئے تھے۔ امین الاسلام نے ہمیں مصوری کے کئی اچھے نمونے دکھلائے۔ خصوصیت کے ساتھ کم عمر بچوں کی بنائی ہوئی تصویروں نے ہمیں کافی متاثر کیا۔ امین الاسلام نے بتایا کہ اس وقت انسٹیٹوٹ میں ۱۲۵ طلبا ہیں جن میں ۱۲ لڑکیاں ہیں اور تقریباً ۴۵ بچے بچوں سے صرف تین روپے فیس لی جاتی ہے۔ ہمیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ شوقین طلبا کو یہاں آرٹ کی تعلیم کے سلسلے میں تمام سہولتیں مہیا ہیں۔ زین العابدین بلاشبہ پاکستان کے مایۂ ناز مصوّر ہیں اور بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں۔ ۴۳ء کے قحط بنگال کی سچی تصویر کشی سے ان کی شہرت کا آغاز ہوا تھا اور جلد ہی انھوں نے مشہور مصوروں میں اپنے لئے جگہ بنالی تھی۔ ان کے لائق شاگرد امین الاسلام بھی اسی ادارہ کے تربیت یافتہ ہیں۔ اور حکومت اٹلی کے وظیفہ پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد فلورنس، روم، واشنگٹن، بغداد، ٹوکیو، کراچی، لاہور اور ڈھاکہ وغیرہ میں اپنی تصاویر کی نمائش کرکے کئی اعزاز حاصل کر چکے ہیں۔ ملک کے ان مشہور مصوّروں کی نگرانی میں اس ادارہ نے بلاشبہ بے مثال ترقی کی ہے۔ لیکن ہمیں یہ جان کر افسوس ہوا کہ انسٹیٹوٹ کی کارکردگی کا کوئی مطبوعہ لٹریچر

موجود نہیں جس سے کامیاب اور مشہور آرٹسٹوں کے حالات اور ان کی شاہکار تصاویر کا علم ہو سکتا۔

مشرقی پاکستان کی سرزمین فنون لطیفہ کا گہوارہ ہے۔ کیا اچھا ہو کہ حکومت انسٹیٹیوٹ آف آرٹس جیسے فنی اداروں پر معلوماتی کتابچے شائع کرتی رہے۔ ان کتابچوں سے نہ صرف ملک کے آرٹسٹوں کی حوصلہ افزائی ہوگی بلکہ ملک اور بیرون ملک سے آنیوالے بھی اس ادارہ کی کارکردگی سے باخبر ہو سکیں گے۔

سنٹرل پبلک لائبریری

انسٹیٹیوٹ آف آرٹس دیکھنے کے بعد ہم ہوٹل شاہ باغ پہنچے۔ کھانا کھایا۔ کچھ دیر بعد افضل حسین اور رستم علی آگئے اور ہمیں سنٹرل پبلک لائبریری لے گئے۔ پبلک لائبریری کی نئی عمارت دیکھ کر جی خوش ہوا۔ احمد حسین صاحب لائبریرین سے ملے اور اوپر کی منزل کے بڑے ہال میں ہمیں لے گئے۔ جہاں لوگ مصروف مطالعہ تھے۔ احمد حسین صاحب نے بتایا کہ اس لائبریری میں تقریباً ۲۵ ہزار کتابیں ہیں جن میں سے

۱۲-۱۳ ہزار کتابوں کے کیٹلاگ تیار ہو چکے ہیں۔ مختلف الماریوں میں جب ہم نے کتابوں کا جائزہ لیا تو یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ تقریباً ۹۰ فیصدی انگریزی مطبوعات الماریوں کی زینت بنی ہیں۔ اردو اور بنگلہ کی اچھی معیاری کتابیں انڈیا کی مطبوعہ تھیں۔ لائبریری سے ہم پھر ہوٹل شاہ باغ واپس ہوئے کیونکہ پروگرام کے مطابق آج ہی ہمیں سلہٹ روانہ ہونا تھا۔ ہوٹل پہنچے تو افسر ماہ پوری، عابد دانا پوری، اختر پیامی صلاح الدین محمد اور دوسرے احباب ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ دیر تک مختلف مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔ ان احباب کی خواہش تھی کہ ہم ڈھاکہ میں زیادہ قیام کریں تاکہ یہاں کے ادیبوں سے تفصیلی ملاقات ہو سکے۔ میری اور مولانا خیری کی بھی یہی خواہش تھی۔ وہ ادیبوں کے علاوہ انجمن ادبی رسائل کے سلسلے میں ڈھاکہ کے مدیران جرائد سے بھی تبادلۂ خیال کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ہم نے ان دوستوں کو بتایا کہ نئے پروگرام کے تحت ہماری واپسی ۲۶ جون کو ہوگی اور ۲۷، ۲۸ اور ۲۹ ہم ڈھاکہ میں قیام کریں گے۔ اس طرح تفصیلی ملاقات کے علاوہ ڈھاکہ کی علمی، ادبی اور تہذیبی

سرگرمیوں میں حصہ لینے کا بھی ہمیں موقع مل جائے گا۔

احباب کے رخصت ہونے کے بعد ہم نے سامان سفر تیار کیا۔ پچھلے دنوں ڈھاکہ میں مسلسل بارش ہوئی تھی جس کا علم ہمیں ڈھاکہ آنے کے بعد ہوا۔ ڈھاکہ اور سلہٹ کے درمیان بھی سیلاب کے سبب ایک پل بہہ گیا تھا اور اندیشہ یہ تھا کہ ہمارا یہ سفر ملتوی ہو جائے۔ لیکن مغرب کے بعد افضل حسین اور رستم علی ٹکٹ اور ڈبوں میں کھانا لے کر آ گئے اور ہم سب بھاگم بھاگ عین وقت پر اسٹیشن پہنچے۔ اِدھر ہم سوار ہوئے اور اُدھر ریل روانہ ہوئی۔

سلہٹ

اتوار۔ پیر ـــ ۱۸۔۱۹ جون

ہمارے سفر کی پہلی منزل سلہٹ تھی۔ رات سوتے جاگتے کٹ گئی علی الصبح ہم شائستہ گنج اور رشید پور کے درمیان اُس مقام پر پہنچے جہاں سیلاب کے باعث پل بہہ گیا تھا۔ چنانچہ ہماری گاڑی پل کے اس طرف رک گئی۔ سلہٹ سے آنے والی گاڑی پُل کے دوسری طرف کھڑی تھی۔ پُل سے گذرنے کیلئے تختے ڈال کر آمد و رفت کا انتظام کیا گیا تھا۔ پہلے۔ دوسری گاڑی کے مسافر سامان سمیت ہماری گاڑی پر آئے۔ پھر ہم لوگ اپنا اپنا کچھ سامان

خود اور کچھ قلیوں کے ذریعے لے کر پُل سے گذرے اور سلہٹ جانے والی گاڑی میں سوار ہو گئے۔ اس آمد و رفت میں ایک گھنٹہ سے زائد لگ گیا۔ بہرحال سفر کی اس عجیب نوعیت سے اس علاقے میں بسنے والوں کی مشکلات کا اندازہ مشکل نہ تھا۔

ڈھاکہ سے سلہٹ کا فاصلہ کوئی ۱۹۸ میل اور سفر تقریباً ۹ گھنٹے کا ہے لیکن پُل بہہ جانے اور جگہ جگہ سیلاب کے باعث پٹریوں کی مرمت کے نتیجہ میں ہم ۵ گھنٹے تاخیر سے سلہٹ پہنچے۔ شمس العالم صاحب افسر تعلقات عامہ اسٹیشن پر موجود تھے۔ ان کی معیت میں ہم سرکٹ ہاؤس پہنچے۔ جہاں ایم اے خاں صاحب ڈپٹی کمشنر نے ہمارا خیر مقدم کیا، سرکٹ ہاؤس ندیا سُرما کے کنارے واقع ہے۔ نہا دھو کر کھانا کھایا۔ کھانے میں انناس بھی تھا جس کی لذت آفرینی اور تاثیر نے تازہ دم کر دیا۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو سلہٹ کے چند صحافی ملاقات کے لئے آ گئے۔ ان میں اے پی پی کے نمائندے محمد رضی الرحمٰن، سری اروں بکار چندا سب ایڈیٹر جن ساہتی (Janasathi) اے منان ایڈیٹر آواز اور ایس ایچ خاں نمائندہ یو پی پی قابل ذکر ہیں۔ دورانِ گفتگو ان حضرات نے بتایا کہ سلہٹ میں ۸ پریس ہیں۔ لیکن

کوئی روزنامہ یہاں سے شائع نہیں ہوتا۔ اخبارات کی مالی حالت
بتر ہے۔ حکومت اور صنعت کار ان اخبارات کو نہ اشتہارات
دیتے ہیں نہ ان کی سرپرستی کرتے ہیں۔ ایک صحافی نے یہ تجویز پیش
کی کہ اگر فنانس کارپوریشن کے انداز کا کوئی ادارہ یہاں قائم
ہو جائے تو اخبارات اور صحافیوں کی مشکلات دور ہو سکتی ہیں
کیونکہ ابھی اس علاقہ میں علم و مطالعہ کا عام رجحان پیدا نہیں
ہو سکا ہے۔ اخبارات اور رسالے یہ خدمت انجام دے سکتے
ہیں بشرطیکہ انھیں مالی پریشانیوں سے نجات مل جائے۔

صحافیوں کے رخصت ہونے کے بعد ہم سلہٹ کے خاص خاص
مقامات دیکھنے کے لئے روانہ ہوئے، سب سے پہلے ڈنکن برادرس
کے چاء کا باغ دیکھا۔ جو تقریباً ۲۵ میل کے رقبہ میں پھیلا تھا۔
پٹ سن کے بعد مشرقی پاکستان کی سب سے بڑی دولت چائے کے باغات
ہیں جن کی تعداد ۱۲۱ ہے۔ سلہٹ ان چائے کے باغات، خوبصورت
اور سحر انگیز مناظر، سرسبزی اور شادابی کے لئے اپنی نظیر آپ ہے، ڈنکن
برادرس کے منیجر حیدار صاحب لے ہیں ابتدا تا آخر چائے تیار کرلے
اور پیک کرنے کا ہر مرحلہ دکھایا۔ پتیوں کو توڑ کر پیسا جاتا ہے۔ پھر
انھیں خشک کیا جاتا ہے۔ خشک ہونے کے بعد چورا علیحدہ کر لیتے ہیں

پھر موٹی اور درمیانی پتیاں علیحدہ علیحدہ ڈبوں میں بند کر دی جاتی ہیں۔ یہ سارا کام خودکار مشینوں سے انجام پاتا ہے۔ چائے کے درختوں سے چائے کی پیکنگ تک اس میں درخت کی اپنی خوشبو کے علاوہ کوئی خوشبو نہیں ہوتی۔ یہ سادہ چائے بڑی بڑی کمپنیاں خریدتی ہیں اور اپنی اپنی پیکنگ میں خوشبو ملا کر فروخت کرتی ہیں
چائے کا باغ اونچی نیچی پہاڑیوں پر نہایت دلکش منظر پیش کر رہا تھا ابھی دھوپ تھی ــــ تھوڑی ہی دیر میں کچھ ابر کے ٹکڑے آ گئے اور ہلکی سی بارش بھی ہو گئی۔ چائے کی پتوں کو جمع کرنے والی اس علاقے کی عورتیں جس تیزی صفائی، چابکدستی اور مہارت سے درخت کی اوپری پتیاں توڑتی ہیں اور ٹوکریوں پر ٹوکریاں بھر لیتی ہیں بلاشبہ وہ انھیں کا حصہ ہے۔ اس تمام علاقے میں تقریباً ۵۰ ہزار میل رقبہ میں چائے کے باغات پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں ڈنکن برادرس اور جیمس فنلے کے باغات مشہور بھی ہیں اور کافی بڑے بھی ہیں۔ مجموعی طور پر ۶۰ فیصدی باغات ابھی تک انگریزوں کے قبضے میں ہیں ــــ اور جیسا کہ ہمیں بتایا گیا پاکستانی حضرات کے انتظام میں جو چائے کے باغات ہیں ان کی حالت انگریزوں کے مقابلے میں ابتر ہے۔ چائے کا باغ دیکھ کر واقعی سب

باغ باغ ہو گئے تھے۔ افسوس کہ وقت کم تھا اسلئے اصرار کے باوجود ہم چھاٹرے کے باغ کی سیر کے بعد چائے پیئے بغیر پاک وہند سرحد کی طرف روانہ ہو گئے۔ سلہٹ سے آسام کی سرحد ملتی ہے اور اس کا فاصلہ تقریباً ۲۵ میل ہے۔ کچھ ساتھیوں کا اصرار کچھ کا انکار۔ آخر مولانا خیری کی خواہش کے احترام میں ۱۴ یا ۱۵ میل جانے کے بعد ہماری واپسی ہوئی واپسی میں سلہٹ پاکستان پٹرولیم، سلہٹ گیس فیلڈ اور عید گاہ دیکھتے ہوئے ہم شاہ جلالؒ کے مزار پر پہنچے اور فاتحہ پڑھی۔

شاہ جلالؒ

شاہ جلالؒ بنگال کے مشہور چھ اولیائے کرام میں ہیں اور غیر مسلم بھی آپ سے عقیدت رکھتے ہیں۔ آپ شاہ جلال سلہٹی کے نام سے بھی مشہور ہیں اور آپ کا مزار مبارک مرجع خلائق ہے اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور اس خطہ کو مسلم سلطنت میں شامل کرنے کا سہرا آپ ہی کے سر ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ ۱۳۰۴ء میں آپ نے سلہٹ کے راجہ گور گوبند کے خلاف جہاد کیا اور اس پر فتح پائی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب شہنشاہ علاءالدین خلجی فرمانروائے دہلی تھا۔

سلہٹ پر شاہ جلالؒ کے حملہ کی وجہ تسمیہ جس پر تمام مورخین اور تذکرہ نگاروں نے اتفاق کیا ہے یہ ہے :-

"اس وقت سلہٹ کا راجہ ایک ہندو تھا جو گور گوبند کے لقب سے مشہور تھا۔ اگرچہ سلہٹ مسلم سلطنت میں شامل نہ تھا مگر وہاں مسلمانوں کے قدم پہنچ چکے تھے برہان الدین نامی ایک مسلمان مع اہل و عیال کے وہاں مقیم تھے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے کافی مدت کے بعد ایک لڑکا دیا تھا۔ برہان الدین نے عقیقہ کے موقع پر ایک گائے ذبح کی، راجہ گور گوبند کو جب اس کی اطلاع پہونچی تو اس نے انتہائی تعصب میں شیخ برہان الدین کو پکڑ بلوایا اور انکے لڑکے کو اسی وقت قتل کرا دیا۔ یہ المناک حادثہ شیخ برہان الدین کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ خدا کے حضور میں سالہا سال گڑگڑانے کے بعد یہ بچہ ہوا تھا، اس کی شہادت راجہ گور گوبند کی بے رحمی و سفاکی کی بدترین مثال تھی شیخ برہان الدین نے سلطان شمس الدین فیروز شاہ دہلوی سے جا کر فریاد کی۔ سلطان نے گور گوبند کے ظلم و ستم کے خلاف اپنے بھانجے سکندر خاں غازی کو جو علاء الدین خلجی کا بھتیجا بھی تھا سلہٹ پر حملہ کرنے کا

حکم دیا چونکہ یہ حملہ ملک گیری کے لئے نہیں تھا اس لئے اس دور کے بزرگان وصوفیائے کرام نے بھی ساتھ دیا اور مہم کی حیثیت ایک ظالم کے خلاف جہاد کی ہو گئی گروہ کی قیادت حضرت شاہ جلال نام کے بزرگ کر رہے تھے۔ گور گوبند کو اسلامی لشکر کے مقابلے میں شکست ہوئی وہ تاج و تخت چھوڑ کر فرار ہو گیا اور سلہٹ پر اسلامی پرچم لہرانے لگا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شاہ جلال کے ساتھ ان کے ۳۶۰ مریدین و خلفاء بھی تھے جن میں سے چند کے نام یہ ہیں:-

علی شہزادہ یمنی، عمر سمرقندی، سید محمد غزلوی، ذکریا عربی۔ سید علاء الدین بغدادی۔ شاہ کمال یمنی، شاہ بزدانفغانی شاہ جنید گجراتی، عارف ملتانی، شاہ داؤد قریشی، مخدوم جعفر غزلوی، شاہ حسام الدین نارنولی۔ شاہ حسین الدین بہاری، سید قاسم دکنی۔ نظام الدین بغدادی، نظام الدین کرمانی شاہ شمس الدین بہاری اور شریف اجمیری۔ شاہ جلال اور سکندر غازی کے علاوہ تیسری اہم شخصیت شاہ نصیر الدین کی تھی وہ مہم میں لیڈر شپ کے فرائض

انجام دے رہے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے سلہٹ میں ورود کے وقت شاہ جلال کی عمر ۳۲ سال تھی ۱۳۰۳ء میں سلہٹ فتح ہوا اور ۱۳۴۷ء میں حضرت شاہ جلال وصال فرما گئے۔

شاہ جلالؒ کے علاوہ سلہٹ میں اور بھی بزرگوں صوفیوں اور برگزیدہ شخصیتوں کے ان گنت مزارات ہیں۔ ہمارے ایک ہمسفر ایس ایم مبارک صاحب وکیل نے ہمیں دوران سفر سلہٹ کے کئی واقعات سنائے تھے اور یہ بتایا تھا کہ رمضان بھر سلہٹ میں عشاء سے تہجد تک باجماعت ——— نماز پڑھی جاتی ہے اس طرح ایک روایت ہم نے یہ بھی سنی کہ کسی ہندو راجہ نے آپ کے راستے میں سل ڈال کر آپ کا راستہ روکنا چاہا تھا چنانچہ شاہ جلالؒ نے اپنی کرامت دکھائی اور کہا ——" سل ہٹ" —— جب سے اس شہر کا نام سلہٹ پڑ گیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

شاہ جلالؒ کے مزار کا انتظام اچھا تھا۔ مزار سے ملحقہ دکانیں اور زمین ٹیکس سے مستثنیٰ ہے۔ مشرقی سمت میں ایک بڑا تالاب ہے جس میں رنگارنگ مچھلیاں ہیں۔ انھیں پکڑنے کی اجازت نہیں۔ اگر کوئی مچھلی مر جاتی ہے تو اسے دفن کر دیا جاتا ہے۔

مزار پر حاضری دیکر ہم سرکٹ ہاؤس پہنچے۔ سرکٹ ہاؤس کے پاس ہی دریائے سرما کا بڑا پل ہے اس میں ہزاروں کبوتر بستے ہیں جنہیں مارنے کی اجازت نہیں۔ مچھلیوں کی طرح کبوتروں سے بھی شاہ جلال کی پسند وابستہ ہے۔

سلہٹ کی سیر ہم بمشکل چار گھنٹے کر سکے۔ پھر بھی یہ اندازہ ہو گیا کہ سلہٹ جن خصوصیات کی بنا پر مشہور ہے وہ صرف دیکھنے سے ہی تعلق رکھتی ہیں۔ سلہٹ میں قیمتی جنگلات ہیں انناس اور کٹھل (جو ہمارے ایک رفیق سفر ذاکر علی کو بے حد مرغوب تھا۔ ڈھاکہ اور سلہٹ کے دوران سفر وہ کٹھل خرید کر ہمیں اس کی لذت سے بھی آشنا کر چکے تھے جسے بہار منہ کھانے کے نتیجہ میں — ہماری زبان میں "متلائی کیفیت" سے دوچار ہو گیا تھا) کے علاوہ بانس اور بانس کی مصنوعات چھالیہ اور تیز پات وغیرہ کثرت سے پیدا ہوتا ہے۔ سرما دریا جو سرکٹ ہاؤس کے سامنے ہی تھا۔ اس علاقے کی آبیاری ماہی گیروں کی زندگی اور عوام کی خوشحالی کا امین ہے۔ یہ دریا آسام سے نکلا ہے اور تقریباً ۵۶۰ میل تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ دریا بڑا طوفانی ہے۔ برسات میں اکثر اس میں سیلاب آتا ہے اور جنگل میدان، انسان، حیوان سب کو بہا لے جاتا ہے

طوفان سے تباہی کے بعد اس دریا کی زرخیز مٹی طوفان سے بچنے والوں کے لیئے باعث رحمت بھی بن جاتی ہے۔ اس دریا پر بند باندھنے کی سعی و کوشش جاری ہے۔ کشیارا کے شمالی مقام فینچو گنج سے "مانک کونا" تک اور جنوب میں سلہٹ سے لوا کھالی تک سیلاب کی روک تھام کے لئے اونچے اونچے راستے بنائے گئے ہیں۔ لیکن اکثر یہ دریا تمام رکاوٹوں کو توڑ پھوڑ کر پاگل دوشیزہ کی طرح بستی بستی شور مچاتا ہے اور تباہی پھیلاتا ہے ویسے یہ اسی دریا کا فیض ہے کہ بڑے بڑے جہاز کشیارا سے سلچر تک با آسانی سفر کرتے ہیں اور سامان تجارت لاتے اور لے جاتے ہیں۔ دریا کے کناروں پر دور دور تک آبادی ہے، یہاں کے عوام محنتی اور سادگی پسند ہیں اس دریا کی مچھلیاں روزی بھی فراہم کرتی ہیں۔ سلہٹ کی سیر کو آنے والے ان گنت کشتیاں بادبانوں کا سینہ تانے اس دریا پر ہر وقت دیکھ سکتے ہیں یہاں کے مانجھی اور ملاح شاعر بھی ہیں وہ جب اپنے گیتوں کی تانیں اڑاتے ہیں تو سننے والوں کے دل تڑپ اٹھتے ہیں اور کائنات مسحور ہو کر رہ جاتی ہے۔ چلتے چلتے دریائے سرما کی خصوصیات پر "وسوتن دت" کی مشہور نظم کا اقتباس ملاحظہ ہو:

"دیکھو آج پھر وہ دیوانی وحشت زدہ ہے۔
اس کے بالوں کی راکھ سے آئی ہوئی جٹاؤں نے
آسمان کو چھپا لیا ہے۔
اپنے میلے ہاتھوں سے وہ ہر چیز کو چھو رہی ہے
اس کے جنوں کی زد سے کوئی بھی محفوظ نہیں"

ہمیں آج ہی واپس ہونا تھا۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد ہم لوگ اسٹیشن پہنچے۔ گاڑی لیٹ تھی۔ تقریباً ½ ۱۱ بجے ہم سلہٹ سے ڈھاکہ کے لئے واپس ہوئے۔ اسٹیشن پر گارڈ نے کہا کہ ریل کے دروازے بند رکھیں۔ ڈاکوؤں کا خطرہ رہتا ہے۔ پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی میں اور مولانا خیری ایک ہی ڈبے میں تھے۔ اس مرتبہ افضل حسین بھی ہمارے ڈبے میں آ گئے تھے۔ مولانا نے جو مجھ سے اپنے بچوں کی طرح محبت کرتے ہیں اور جنہیں میں اپنا بزرگ و محترم سمجھتا ہوں یہ سن کر فرمایا۔

"صہبا صاحب۔ دروازہ اوپر اور نیچے سے اچھی طرح بند کر دیجئے" میں نے عرض کیا۔ "مولانا صاحب خوف کی کیا بات ہے۔ ہمارے پاس رکھا ہی کیا ہے"

مولانا نے فرمایا۔ "احتیاط اچھی چیز ہے"

اور ہم نے ان کے حکم کی تعمیل کی اور دروازہ صبح تک نہ کھولا۔ کیونکہ اس کمپارٹمنٹ میں ہم تین کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔ بہرحال ہمارے ڈبے کی طرف کسی ڈاکو نے رُخ نہیں کیا۔ صبح کئی اسٹیشنوں پر گاڑی ٹھہری۔ ایک ایک دو گھنٹے متعدد اسٹیشنوں پر کسی نہ کسی مجبوری کے تحت صرف ہوئے۔ کبھی معلوم ہوا پل درست ہو رہا ہے۔ کبھی پتہ چلا انجن میں کچھ خرابی ہو گئی ہے۔ راستے میں ہمیں ایک مقام اگرتلہ بھی ملا۔ جہاں سے بھارت کی سرحد صرف ایک میل تھی۔ تقسیم ملک کے وقت اسٹیشن پاکستان کو مل گیا اور آبادی بھارت کے حصے میں آئی۔ ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ بعض علاقے تو ایسے بھی تقسیم ہوئے ہیں کہ مکان کا ایک حصہ بھارت میں ہے تو دوسرا پاکستان میں

اگرتلہ کے بعد اکھوڑا اسٹیشن پر گاڑی پھر رک گئی۔ اور کئی گھنٹے کے بعد روانہ ہوئی اور سست رفتاری سے چلتی رہی بالآخر ۶ بجے شام کو ہم لوگ ڈھاکہ پہنچے۔

سلہٹ کے سفر ہی سفر میں ہمارے تقریباً ۳۸ گھنٹے صرف ہوئے اور ہم بمشکل ۶، ۷ گھنٹے سلہٹ میں گذار سکے۔ اس کے باوجود ڈھاکہ سے سلہٹ کی آمدورفت میں حسین و دلکش مناظر، ندیوں اور دریاؤں اور پہاڑیوں کے پھیلے ہوئے

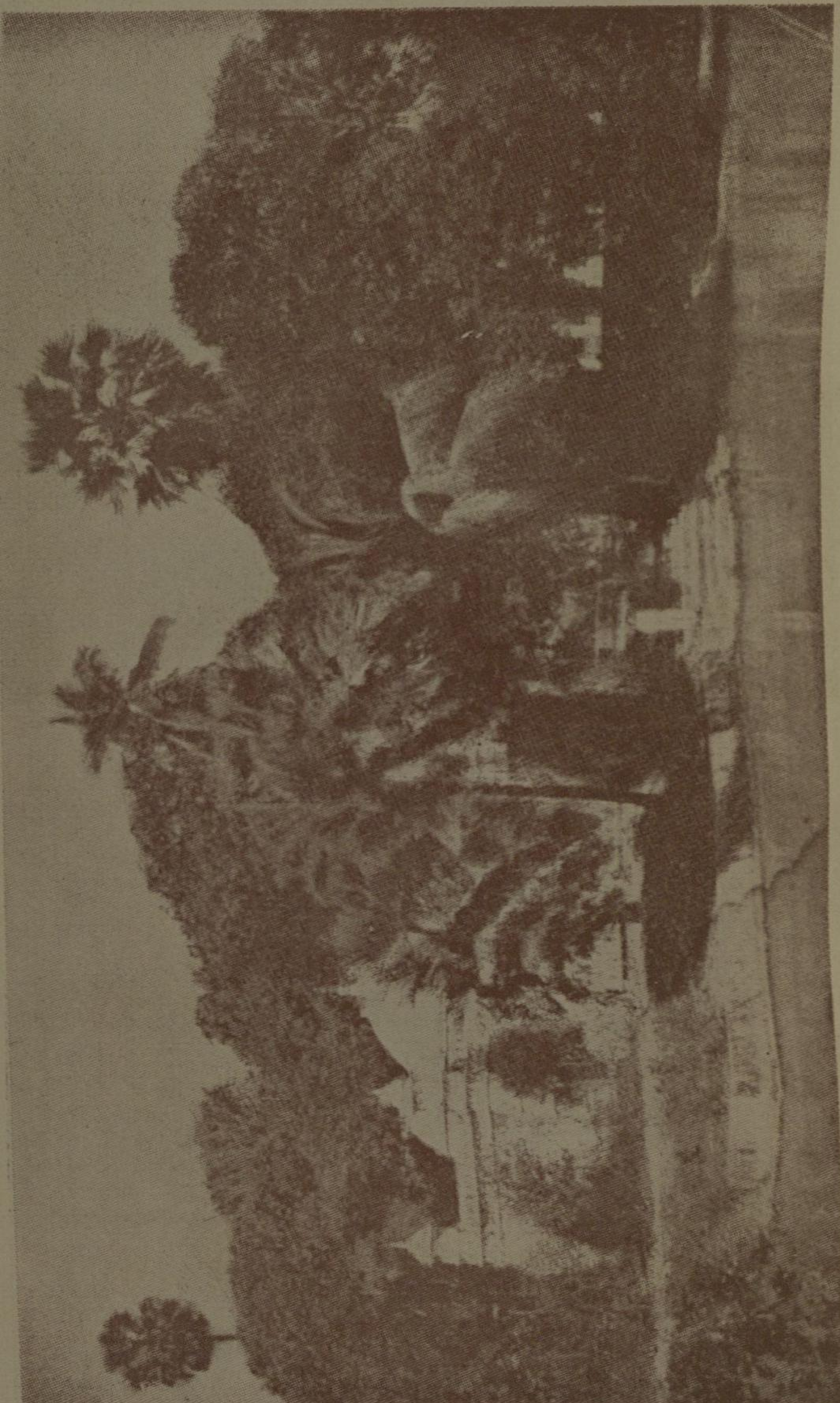
طویل سلسلوں اور خوبصورت اور شاداب کھیتوں کی یاد ہمیشہ تازہ رہےگی
کہتے ہیں بنگال کا جادو دراصل یہی روح پرور مناظر ہیں۔ یہاں
کے نغمے ہیں۔ وہ شاعر اور ادیب ہیں جنہوں نے اس دھرتی سے اس
کے آکاش سے پیار کیا ہے اور اپنے پیار کی نشانی کے طور پر ان
گنت گیتوں اور کہانیوں کو جنم دیا ہے جن میں حسن بھی ہے
سچائی بھی۔ عوام کا دکھ بھی ہے اور سکھ بھی۔ میں نے سوچا۔
یہی ہے وہ میرے خوابوں کی سرزمین جس سے مجھے نادیدہ
محبت تھی اور آج اس خوبصورت سرزمین کی آغوش میں پہنچکر
میری بےچین روح کو سکون میسر آگیا تھا کیونکہ اس سرزمین
کے کروڑوں عوام سے میرا ازلی رشتہ ہے جو ابد تک قائم
رہے گا۔



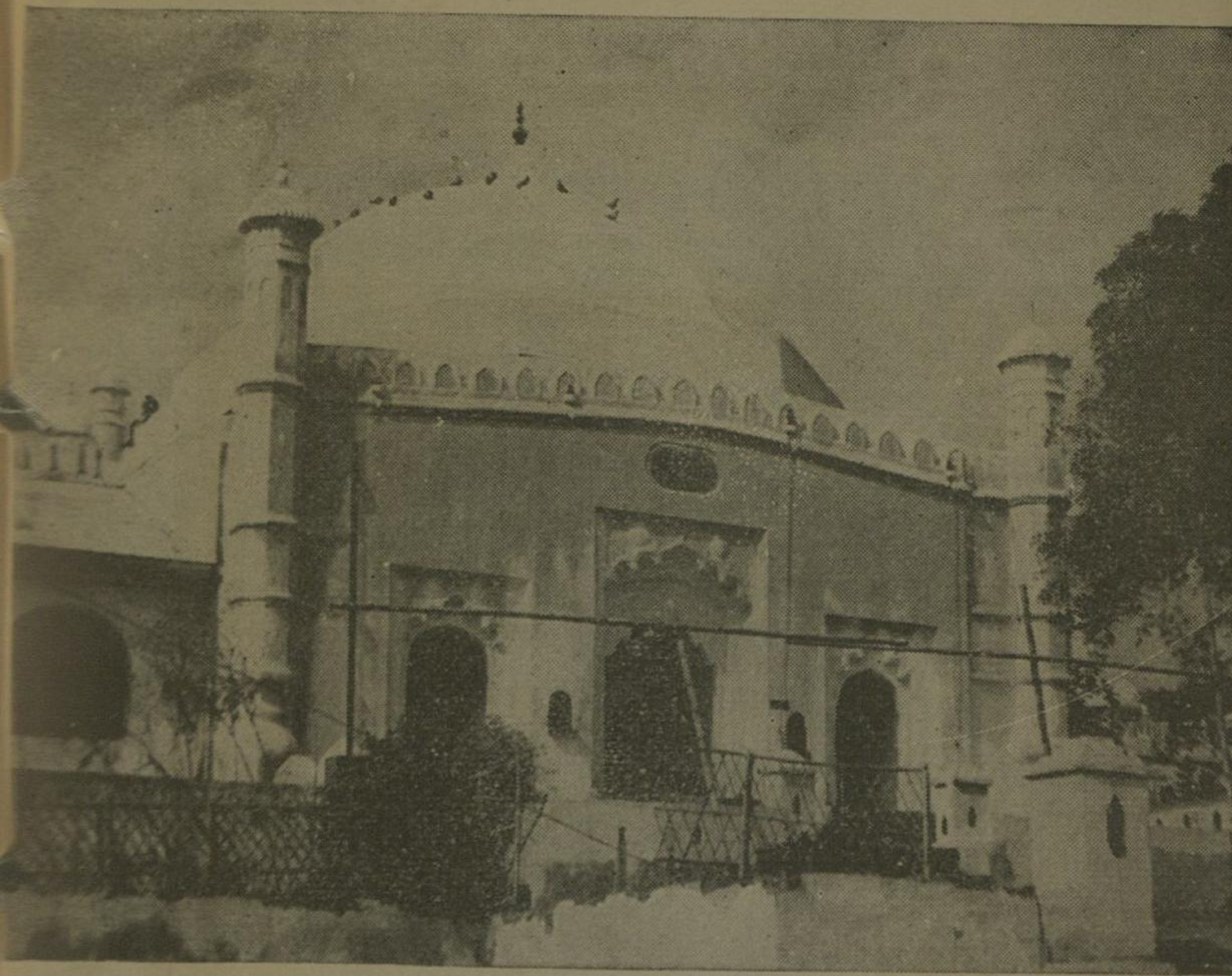
چھوٹا سونا مسجد ——— ۱۴۹۳ء
(فیروز پور، راجشاہی)



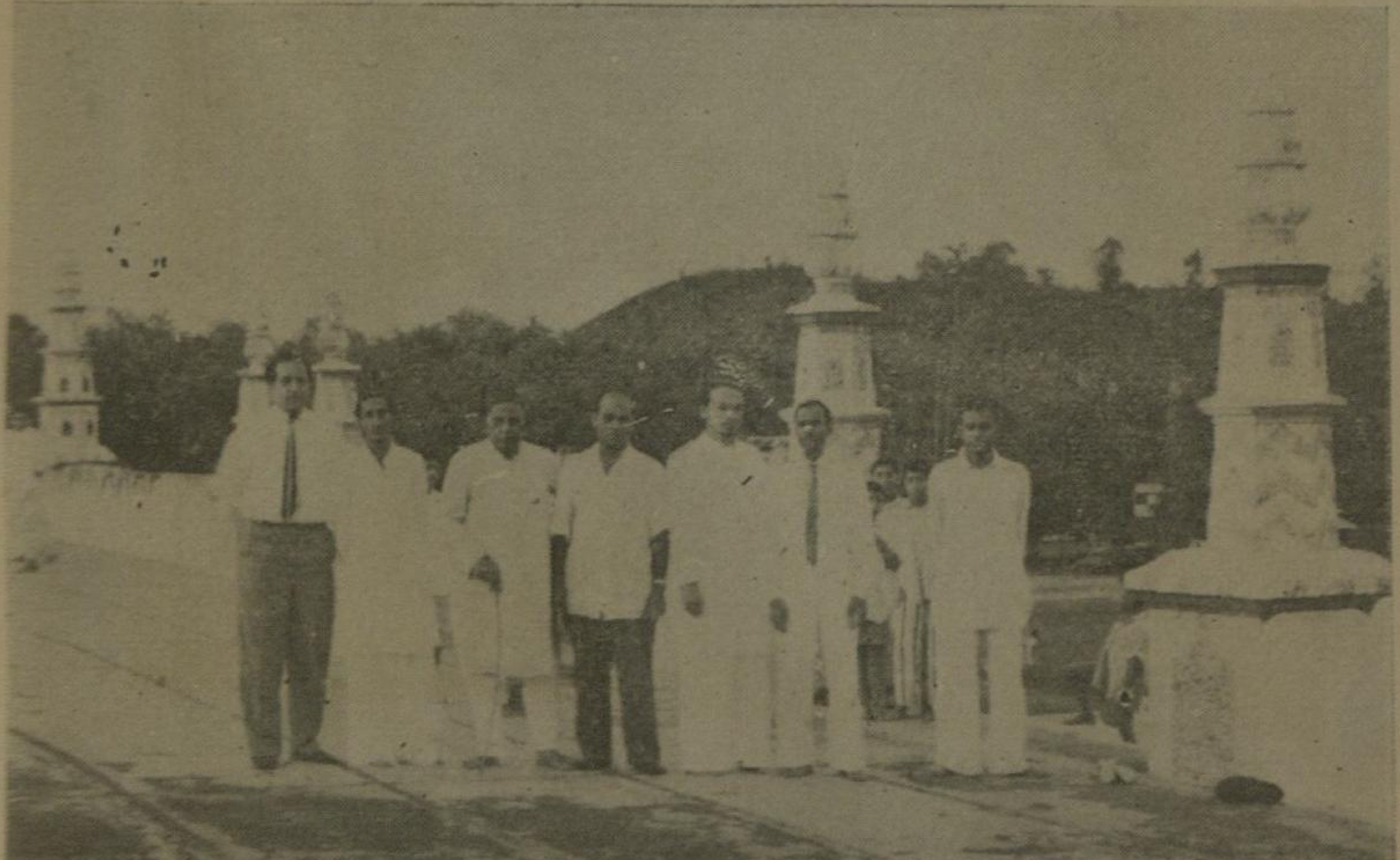
ست گنبد مسجد ـــــ ۱۴۵۹ء
(باگیر ہاٹ ــ کھلنا)

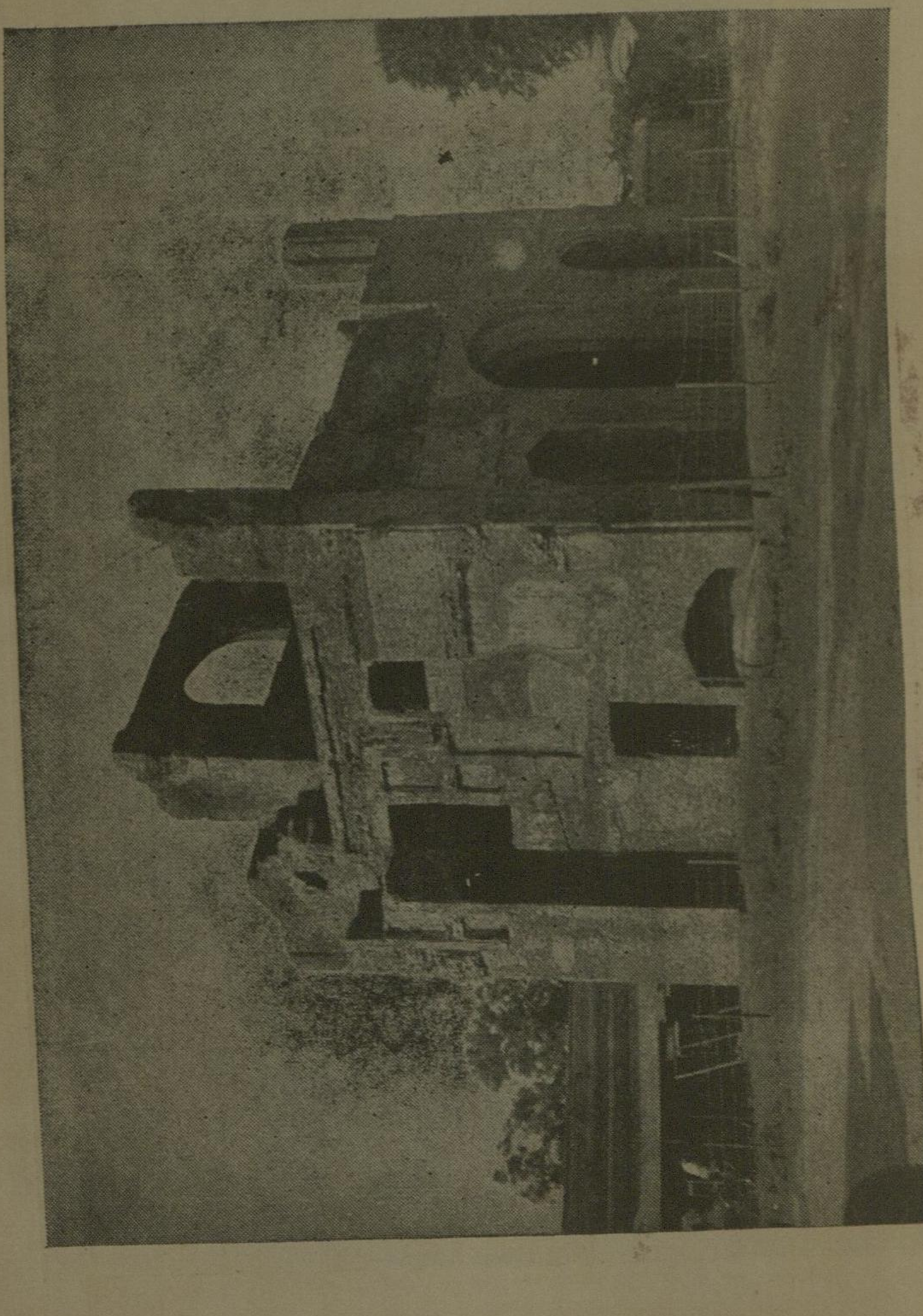


مقبرہ حضرت بایزید بسطامی رح
(نصیرآباد — چاٹگام)

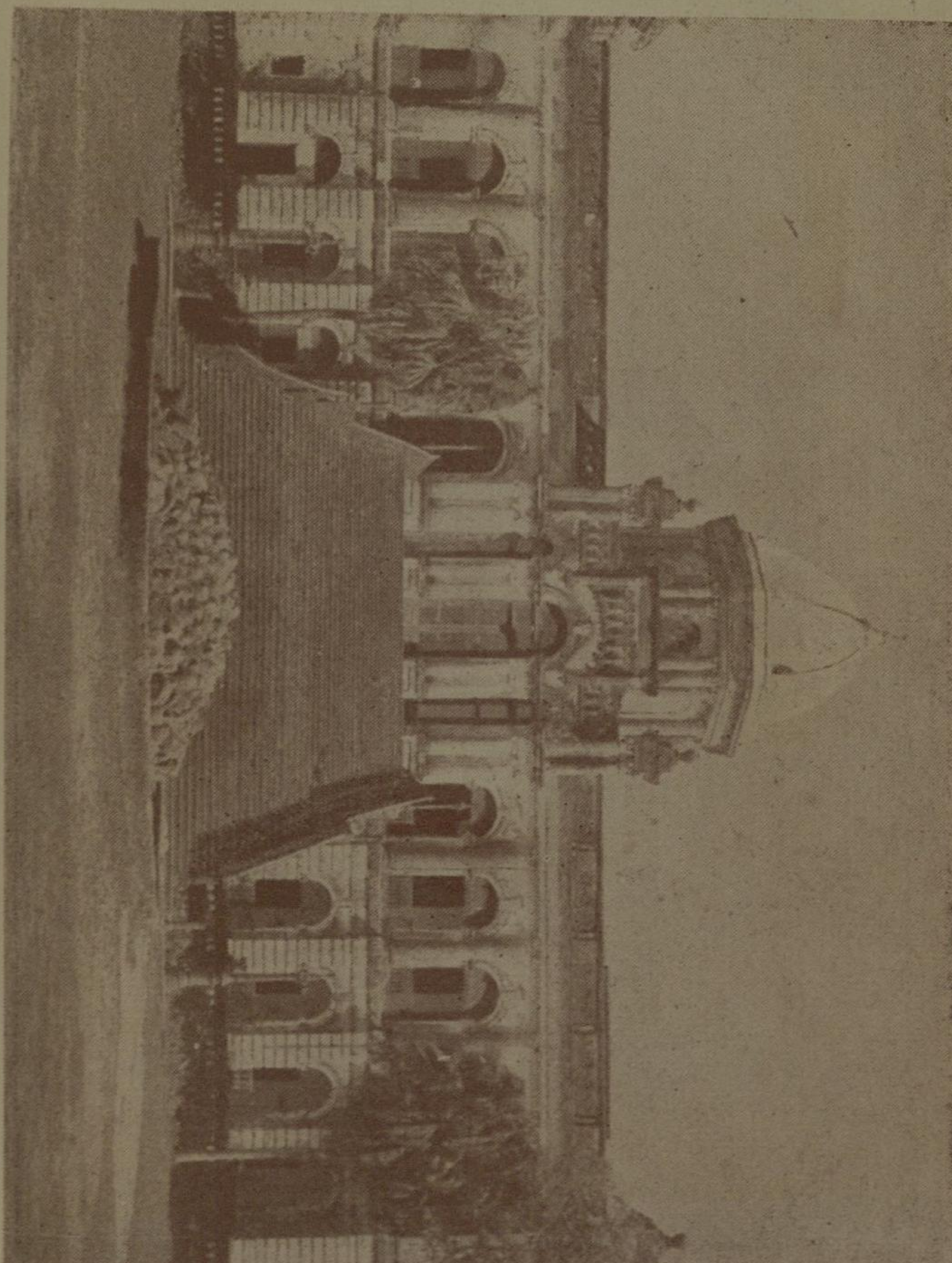


مزار شاہ جلال رح (سلہٹ)

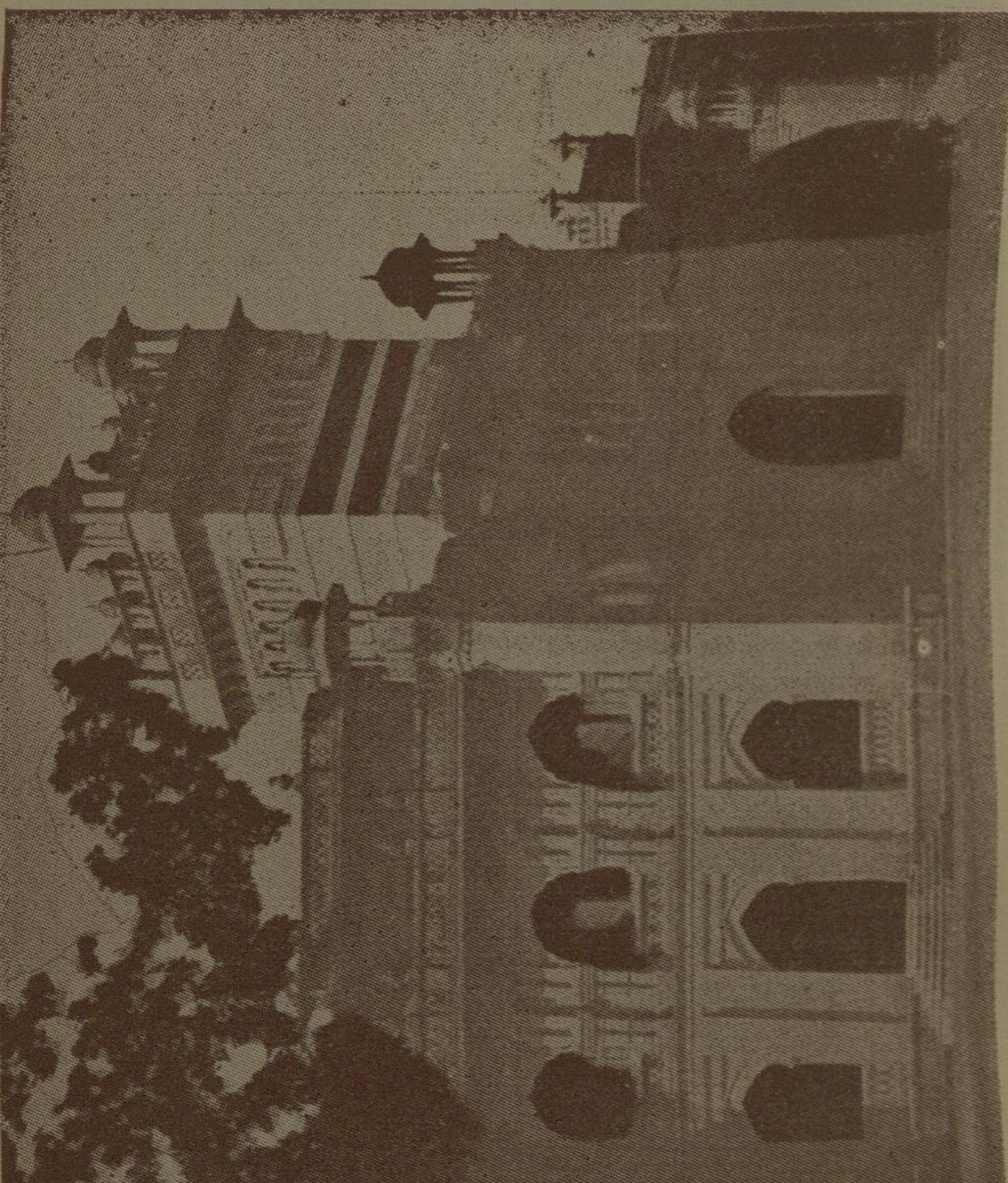




قلعۂ لال باغ ڈھاکہ کا ایک منظر



احسن منزل، ڈھاکہ



ڈھاکہ یونیورسٹی



کاکس بازار کا ایک منظر

جیسور، کُھلنا

منگل ——— ۲۰ جون

رات ہم نے ڈھاکہ میں گزاری۔ ۲۰ کی صبح پروگرام کے مطابق ہمیں ہوائی جہاز سے جیسور روانہ ہونا تھا اور جیسور سے کُھلنہ ہوٹل شاہ باغ سے تقریباً گیارہ بجے روانہ ہو کر ہوائی اڈے پر پہنچے۔ ساڑھے گیارہ بجے ہمارے جہاز نے پرواز کی اور بمشکل ۳۵ منٹ میں ہم جیسور پہنچ گئے۔

ڈھاکہ سے جیسور کا فاصلہ کوئی ڈیڑھ سو میل اور ریل کے ذریعہ پانچ گھنٹے کا سفر ہے۔ لیکن ہوائی جہاز نے گھنٹوں کے فاصلے کو منٹوں میں

بدل دیا۔ جہاز کا کرایہ بھی کچھ زیادہ نہیں۔ صرف ۳۳ روپے۔ یہ ہوائی سفر ہم نے دن میں کیا تھا۔ اس لئے مناظر کی دلکشی سے کافی لطف اندوز ہوئے۔ جہاز کی کھڑکیوں سے زمین پر دور دور تک سبزہ کا فرش بچھا نظر آ رہا تھا۔ درمیان میں اونچے نیچے مکانوں کے سلسلے تھے۔ ندیاں اور دریا سانپ کی طرح لہرا رہے تھے جب ہم ڈھاکہ سے روانہ ہوئے تھے موسم نہایت خوشگوار تھا ہلکے اور گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اور خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ لیکن ۵ منٹ کے بعد جب ہم جیسور پہنچے تو موسم بدل چکا تھا۔ دھوپ میں تیزی بھی تھی اور گرم ہوا بھی چل رہی تھی۔ کچھ دیر ہم ہوائی اڈے پر ٹھہرے۔ سامان لیا اور پھر جیپوں میں کھلنا کے لئے روانہ ہو گئے۔

جیسور سے کھلنا کا فاصلہ ۳۸ میل ہے اور سڑک نہایت صاف ستھری یہی سڑک کلکتہ تک جاتی ہے۔ جیسور سے کلکتہ تقریباً ۷۰ میل ہے۔ سڑک کے دونوں طرف ناریل اور چھالیہ کے قطار در قطار درختوں کے علاوہ پان کی بیلیں بھی ہمیں نظر آئیں اور دور دور تک دھان اور پٹ سن کے کھیت بھی۔

دریائے گنگا کئی شاخوں میں بٹ کر خلیج بنگالہ میں گرتا ہے۔ ان ہی دریاؤں میں سے ایک دریا بھیرب[1] بھی ہے۔ بھاگیرتی اور

---

[1] بھیرب کے لفظی معنی ہیں "خوفناک"۔ دریا کا یہ نام اس لئے پڑا کہ برسات میں اس کا پاٹ بہت ہی چوڑا ہو جاتا ہے اس کا اصل دھارا "جالنگی" کہلاتا ہے جو مشرقی پاکستان کے شہر درشنا سے ہوتا ہوا کاباڈی دانگا کے قریب جیسور ضلع میں پہنچتا ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بھیرب کے کنارے سب سے اہم تاریخی شہر "باگیرہاٹ" واقع ہے مشرقی پاکستان میں اسلام کے فروغ کے سلسلے میں اس شہر کی عظمت و اہمیت کا ثبوت وہ یادگار عمارتیں ہیں جو آج بھی زبان حال سے اپنی تاریخ سنا رہی ہیں۔ پندرھویں صدی میں جب سلطان ناصر الدین بنگال کا بادشاہ ہوا تو اس نے اپنے سپہ سالار خان جہاں کو کھلنا اور جیسور کے علاقے فتح کرنے کے لئے روانہ کیا، خان جہاں دریائے بھیرب ہی کے راستے اس علاقے میں پہنچا اور جو علاقے اس نے فتح کئے ان سب کو ملا کر "خلافت آباد" کا نام دیا گیا، اور "باگیرہاٹ" اس علاقے کا دارالحکومت بنایا گیا۔ باگیرہاٹ میں خان جہاں نے جو محل اور قلعے بنوائے تھے وہ امتداد زمانہ سے مٹ چکے ہیں

باقی اگلے صفحہ پر

پدما اس کی حد بندی کرتے ہیں۔ بھیرب۔ بھاگیرتی سے نکلتا ہے اور جب پدما میں پانی بہت چڑھ جاتا ہے تو وہ بھی بھیرب میں آجاتا ہے یہ دریا جیسور اور کھلنا ضلعوں کے درمیان بہتا ہے۔ اس کے مغربی کنارے پر جیسور واقع ہے جو ہوائی اڈے کے علاوہ تجارتی اور معاشی اعتبار سے بھی کافی اہمیت رکھتا ہے اور تاریخی لحاظ سے بھی۔ اس شہر کی آبادی تقریباً ۷۵ ہزار ہے۔ مغلوں کی حکومت کے آغاز میں راجہ پرتاب دیتا کا دارالحکومت جیسور ایشوری پور نام کا ایک شہر تھا جو ضلع کھلنا میں واقع تھا۔ بعد کو یہ نام موجودہ شہر جیسور کو دیدیا گیا۔ جیسور کے لفظی معنی ہیں شان و شوکت کو مٹا دینے والا۔ یہ نام اس شہر کو اسلئے دیا گیا کہ اس کے آباد ہونے سے مسلمانوں

ــــــ مگر اس کا شاندار مقبرہ اور سات گنبدوں والی مسجد آج بھی موجود ہے۔ یہ مشرقی پاکستان کی سب سے بڑی مسجد ہے اور فن تعمیر کا نادر نمونہ۔ باگیرہاٹ آج بھی ایک بڑی زیارت گاہ ہے کیونکہ عام طور پر لوگ خان جہاں کو سپاہی سے زیادہ ولی مانتے ہیں ــــــ خان جہاں کے مزار پر ایک تاریخی قطعہ بھی کندہ ہے۔ جس سے ۱۴۵۹ء کی تاریخ نکلتی ہے۔

کے دارالحکومت "گوڑ" کی اہمیت ختم ہوگئی۔

دو ڈھائی گھنٹے کا سفر دلچسپ باتوں اور قیوم ملک کے لطیفوں میں معلوم بھی نہ ہوا۔ راستے میں ایک دیہات میں ٹھہر کر ہم نے تازہ ناریلوں کا پانی جسے ڈاب کہتے ہیں لطف لے لے کر پیا۔ ڈاب بے حد لذیذ اور فرحت بخش تھا۔ خیر البشر نمائندہ آبزرور نے جو جیسور سے ہمارے ساتھ آئے تھے بتایا کہ انقلاب سے پہلے جیسور کی سرحدوں پر اسمگلنگ کا کافی زور تھا۔ بھارت سے بیڑی کے پتے ناجائز طور پر یہاں آتے تھے اور یہاں سے مشینوں کے پرزے اور دوائیں وغیرہ اسمگل کی جاتی تھیں لیکن حکومت کے سخت اقدام کے سبب یہ سلسلہ اب ختم ہو گیا ہے انھوں نے یہ دلچسپ انکشاف بھی کیا کہ جیسور سے کھلنا تک ۳۸ میل کی سڑک انقلاب سے پہلے پچھلے سات سالوں میں صرف ۱۸ میل تک بن سکی تھی اور انقلاب کے بعد صرف ڈیڑھ سال میں بقیہ سڑک تیار ہو گئی۔

تقریباً ۲½ بجے دن کو ہم کھلنا پہنچے، سرکٹ ہاؤس میں سامان رکھا۔ کھانا کھایا اور کھلنا نیوز پرنٹ مل دیکھنے کے لئے روانہ ہو گئے۔

کھلنا نیوز پرنٹ مل

کھلنا نیوز پرنٹ مل دریائے بھیرب کے کنارے واقع ہے۔ اخباری کاغذ سندربن کے جنگلات کی گیوا لکڑی سے تیار ہوتا ہے۔ یہ چھوٹے پتوں کا درخت ہے اور کاغذ سازی میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ گیوا کے جنگلات سندربن کے ڈیلٹاؤں کی دلدلی زمین میں ۶۰۰ مربع میل میں پھیلے ہوئے ہیں۔ شکل و شباہت میں گیوا سفیدے کے درخت سے ملتا جلتا ہے۔ لیکن بہت خمیدہ اور اوسطاً ۳۵ فٹ بلند ہوتا ہے۔ اس کی چھال ہلکے بھورے رنگ کی ہوتی ہے۔ چھال سے جو رطوبت خارج ہوتی ہے وہ اگر جسم پر لگ جائے تو کھجلی ہونے لگتی ہے اور عارضی طور پر انسان کو اندھا بھی کر دیتی ہے اس کے باوجود درخت کا گودا کارخانے میں تیاری کے بعد کاغذ کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے جس پر روزانہ لاکھوں کروڑوں الفاظ چھپتے ہیں الفاظ جو ظلم، نفرت اور جہالت کو ختم کرنے اور علم و فکر کے فانوس روشن کرنے کا مقدس فریضہ انجام دیتے ہیں۔

جب ہم مل میں پہنچے تو ہمایوں کبیر صاحب کیمسٹ ہماری

رہبری کے لئے ساتھ ہو گئے اور ہمیں مل کے تمام شعبے اول تا آخر دکھائے۔ انھوں نے بتایا کہ گیوا لکڑی سندربن سے حاصل کرنے کے بعد دریائے پسر میں لٹھوں کی صورت میں ڈالدی جاتی ہے۔ یہ دریا کافی گہرا ہے ——— جب لکڑی کے لٹھے بہہ کر آتے ہیں تو کرین سے انھیں اٹھالیا جاتا ہے۔ چھال اتار نے کے بعد انھیں مقررہ لمبائی میں کاٹتے ہیں گودے کو دھویا جاتا ہے اور اسے پیسنے کی مشینوں میں ڈالدیتے ہیں۔ پسائی کے بعد اسے چھانا جاتا ہے اور پانی علیحدہ کرنے کے بعد کیمیائی عمل سے گرمی پہنچائی جاتی ہے یہاں تک کہ کاغذ مشین کے بڑے بڑے رولروں پر کپڑے کی طرح لپٹا ہوا برآمد ہوتا ہے۔ یہ کاغذ رول کی شکل میں تیار ہوتا ہے۔ پھر اسے خودکار مشینوں کے ذریعہ مختلف سائزوں میں کاٹ لیتے ہیں اور وزن کے بعد اس کی پیکنگ ۔ ترسیل شروع ہوتی ہے۔

یہاں کاغذ بنانے کی دو مشینیں ہم نے دیکھیں۔ ایک مشین ۸۰ سے ۹۰ ٹن اور دوسری ۶۰ سے ۷۰ ٹن تک کاغذ روزانہ تیار کرتی ہے۔

اخباری کاغذ کی صنعت نے پاکستان کی ترقی میں نمایاں

حصّہ لیا ہے۔ جس کا سہرا پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی کے سر ہے۔ اس مِل پر اب تک پندرہ کروڑ سے زائد صرف ہو چکے ہیں۔ اور اس کو مزید وسعت و ترقی دینے کا پروگرام ہے تاکہ پیداوار میں معتدبہ اضافہ ہوسکے اس کارخانے کے قیام سے پاکستان نے نہ صرف ۶ کروڑ زرمبادلہ بچا لیا بلکہ زائد پیداوار کو برآمد کرکے زرمبادلہ بھی حاصل کر لیا۔ اعداد و شمار کی رو سے سنہ ۶۰ء تک پاکستان نے ملایا، برما، لنکا۔ ہانگ کانگ اور بنکاک وغیرہ میں ۲۴۵۸ ٹن اخباری کاغذ برآمد کیا اور سنہ ۶۱ء تک اس کی مقدار پانچ گنا ہو گئی۔

اسی طرح کارخانہ کے قیام کے بعد پیداوار میں بھی برابر اضافہ ہوتا رہا۔ سنہ ۵۴ء میں اس مِل نے ۱۷ ہزار ۹ سو ٹن کاغذ تیار کیا۔ اور ۶۱ء میں کل پیداوار ۵۷ ہزار ٹن تھی ــــ ایک محتاط اندازے کے مطابق ۶۵ء تک یہ مِل ایک لاکھ ٹن سے زائد مختلف اقسام کا کاغذ تیار کرنے لگے گا۔

کھُلنا کا کاغذ ہر لحاظ سے اچھا ہے۔ کینیڈا اور جاپان کے علاوہ پڑوسی ملک بھارت کے ممتاز ماہرین نے بھی کھُلنا نیوز پرنٹ کی تعریف کی ہے۔ ابتداً بیرونی ملکوں کے ماہرین کی نگرانی میں اس مِل نے کام شروع کیا تھا کیونکہ تربیت یافتہ

عملہ کی کمی تھی رفتہ رفتہ پاکستانی ان کی جگہ لے رہے ہیں اور کوشش یہی ہے کہ جلد سے جلد تمام شعبوں میں پاکستان کے تربیت یافتہ افراد کام کرنے لگیں تاکہ بیرونی ماہرین کی ضرورت باقی نہ رہے۔

جب ہم نے نیوز پرنٹ کی مہنگائی کے بارے میں سوال کیا تو ہمیں بتایا گیا کہ مل پر غیر معمولی خرچ آیا ہے اس لئے کاغذ کی قیمت بیرونی ملکوں کے نیوز پرنٹ سے کچھ زیادہ ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ بیرونی ملکوں میں جو کاغذ برآمد کیا گیا اس کی قیمت مقامی قیمت سے کم تھی۔ مقامی صنعتوں کے قیام کے بعد کوشش اس بات کی کرنی چاہیے کہ ملک کی مصنوعات کم قیمت میں بآسانی دستیاب ہوتی رہیں۔ کھلنا کا نیوز پرنٹ ۷، ۸ روپے سے بڑھ کر ۱۲ اور ۱۳ روپے فی رم تک فروخت ہوا ہے، بیرونی نیوز پرنٹ ۵، ۶، روپے ریم ملتا تھا اس لئے حکومت اور کارخانے والوں کا یہ بھی فرض ہے کہ پیداوار کے اضافے کے ساتھ ساتھ نیوز پرنٹ کی قیمت بھی کم کی جائے تاکہ ملک میں اس کا استعمال بڑھ سکے۔ اس کارخانے کے قیام کا بنیادی مقصد بھی یہی تھا لیکن افسوس کہ پاکستانی نیوز پرنٹ کی قیمتوں کے بڑھتے ہوئے رجحان پر ابھی تک توجہ نہیں دی گئی۔

ابھی ہم کارخانے میں ہی تھے کہ بارش شروع ہو گئی، جیسور میں

موسم گرم تھا جس کا سلسلہ کھلنا تک رہا اور اب بارش ہونے سے موسم خوشگوار ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بارش کا سلسلہ جاری رہا — ہمیں چونکہ شپ یارڈ بھی دیکھنا تھا اس لئے پانی میں بھیگتے ہوئے جیپوں تک پہنچے اور روانہ ہو گئے۔

شپ یارڈ

جب ہم شپ یارڈ پہنچے تو چھ بج رہے تھے۔ اور بارش کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا، شپ یارڈ کے متعلقہ افسران پانچ بجے تک ہمارا انتظار کر کے جا چکے تھے۔ پھر بھی ایک صاحب وہاں موجود تھے جنھوں نے ہمیں شپ یارڈ دکھایا اور دلچسپ تفصیلات بتائیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمبرگ (جرمنی) کے بعد یہ دنیا کا سب سے بڑا کارخانہ ہے جو جدید ترین مشینوں سے آراستہ ہے — یہاں جہازوں کی مرمت بھی ہوتی ہے اور لانچ اور اسٹیمر بھی بنائے جاتے ہیں۔ یہاں کارخانے میں ۳۸۰ فٹ لمبا اور ۷۰۰ ٹن وزنی جہاز بآسانی آسکتا ہے۔ ہم اگر وقت پر پہنچ جاتے تو اس جہاز کو دیکھ لیتے جو آج دریا سے اٹھا کر کارخانے میں لایا گیا تھا۔

شپ یارڈ سے سیدھے ہم سرکٹ ہاؤس پہنچے۔ اس وقت

ڈپٹی کمشنر کی صدارت میں ایک میٹنگ ہو رہی تھی۔ نصف پون گھنٹہ ہم نے ملحقہ کمرے میں گذارا۔ کچھ دیر بعد کھُلنا کے اخبار نویس اور صحافی آ گئے۔ ڈپٹی کمشنر کی میٹنگ ختم ہونے کے بعد ہم سب ہال میں آ گئے اور کافی دیر تک یہاں کی ادبی اور صحافتی سرگرمیوں پر بات چیت ہوئی۔ پتہ چلا کہ اس علاقے میں بھی ادب و صحافت کے لئے فضا سازگار نہیں۔ لے دیکر ڈھاکہ اور چٹاگانگ کے اخبارات کے نمائندے ہیں، ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۸ء تک ہفتہ وار "توحید" شائع ہوتا رہا۔ لیکن پھر مالی مشکلات کے سبب بند ہو گیا، اب صرف "سرمک" اخبار شائع ہو رہا ہے جو مزدوروں کے مسائل سے متعلق ہے۔

کھُلنا ایک صنعتی شہر کی حیثیت سے روز افزوں ترقی کر رہا ہے۔ اس کی آبادی ۴۰ ہزار سے بڑھ کر ایک لاکھ سے زائد ہو گئی ہے۔ کھلنا نیوز پرنٹ و کھلنا شپ یارڈ، جوٹ ملز، میچ فیکٹریاں اور ناریل کی صنعتیں ضلع بھر میں پھیلی ہوئی ہیں۔ جگہ جگہ تعمیراتی کام دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ مستقبل قریب میں اس شہر کی اہمیت بڑھ جائے گی۔

کھُلنا کے پاس دریائے بھیرب کا زور بہت بڑھ جاتا ہے

کیونکہ یہاں "اٹھارہ بنگا" نالے کے ذریعہ پدما دریا کا زائد پانی اس میں آکر مل جاتا ہے۔ یہیں ہندوؤں کی ایک دیوی "کھلانا" کا مندر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کھلنا ضلع کا نام اسی دیوی کے نام پر رکھا گیا ہے۔

کھلنا ضلع میں چار دریا قابل ذکر ہیں۔ بھیرب، جمنا یا جومنا، مدھومتی اور کوپوتو کھو[1]۔ ان دریاؤں سے کئی نالے اور چھوٹی چھوٹی ندیاں نکلتی ہیں جن کے باعث بھول بھلیاں کی سی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ پرانے زمانے میں دریائے کوپوتو کھو کی وہ اہمیت نہ تھی جو آج گنگا۔ کوپوتو کھو یا "گنگا کوباد ک" اسکیم کی وجہ سے اس کو حاصل ہو گئی ہے۔ اس اسکیم سے تین ضلعوں کشتیا، جیسور، اور کھلنا کو فائدہ پہنچے گا۔ کیونکہ ان ضلعوں کے اکثر دریا سوکھ چکے ہیں یا سوکھنے کے قریب ہیں۔

کھانے میں کچھ دیر تھی اس لئے کھلنا شہر کی سیر کا پروگرام بن گیا

---

[1] مشرقی پاکستان کے دریاؤں کے نام عموماً بامعنی اور دلکش ہیں۔ کوپوتو کھو کے معنی ہیں "کبوتر کی آنکھ"۔ بنگالی اس دریا کا خوبصورت نام رکھنے والا شاعر تھا یا ساحر۔

شہر کا خاص بازار سرکٹ ہاؤس سے زیادہ دور نہ تھا اس لئے ہم لوگ پیدل چل پڑے۔ بازاروں میں کافی بھیڑ، رونق اور چہل پہل تھی ہم مختلف بازاروں میں بٹ گئے اور ایک گھنٹے سے زائد گھومتے رہے۔ قیوم ملک میرے ساتھ تھے۔ ایک دوکان پر ہمیں جیسور کے مشہور رنگین کنگھے نظر آئے۔ چنانچہ میں نے اور قیوم ملک نے خرید لئے۔ اِدھر اُدھر چکر لگانے کے بعد بالآخر ہم ایک چوراہے پر مل گئے۔ ذاکر علی کے ہاتھ میں کٹھل تھا جسے وہ بے حد پسند کرتے ہیں۔ مولانا خیری کچھ خفا سے تھے کہنے لگے ذاکر صاحب نے کٹھل کی تلاش میں تھکا دیا۔ یہ سُن کر ذاکر صاحب مسکرائے اور کٹھل کی غیر معمولی صفات بیان کرنے لگے۔ میرے اور قیوم ملک کے پاس کنگھے دیکھ کر مولانا ہمارے ساتھ ہو گئے اور انھوں نے بھی کنگھے خرید لئے، وہاں سے سرکٹ ہاؤس پہنچے۔ کافی تھکے ہوئے تھے۔ کھانا کھایا اور جلد سو گئے۔

سُندربن

بدھ ——— ۱۲ جون

علی الصبح بیدار ہونے کے بعد ناشتہ کیا اور مختصر سا سامان لے کر فاریسٹ گھاٹ پہنچ گئے۔ کچھ دیر بعد ایک لانچ آگئی اور تقریباً ۸ بجے ہم اس میں سوار ہو کر سندربن کے لئے روانہ ہو گئے۔

اس لانچ کا نام ہلسا تھا۔ ہلسا مشرقی پاکستان کی ایک مشہور مچھلی ہے لانچ کے کپتان واحد انصاری جلد ہی ہم سے گھل مل گئے، دریائے بھیرب سے گذر کر ہم دریائے پسر میں پہنچے۔ تقریباً ۹½ بجے چالنا آگیا۔ کھُلنا سے

اس کا فاصلہ ۲۴ میل ہے۔ چٹاگانگ کے بعد چالنا ہی مشرقی پاکستان کی سب سے اہم بندرگاہ ہے۔ جس کی توسیع و تعمیر کا کام پوری رفتار سے جاری تھا۔ چالنا سے گذر کر ہم منگلا پہنچے۔ چالنا اور منگلا کا درمیانی فاصلہ ۸ میل ہے۔ گویا ہم ۳۲ میل لانچ میں ــــــ سفر کر چکے تھے یہ پورٹ ڈائرکٹریٹ کا لانچ تھا اور بہت خوبصورت بنا تھا۔ اس کی رفتار ۱۲ سے ۱۸ میل فی گھنٹہ تھی اس دریائی سفر میں ہمیں بڑے بڑے جہاز بھی کھڑے نظر آئے۔ دریا کے دونوں طرف کا نظارہ بے حد حسین تھا۔ منگلا سے گذرنے کے بعد سندربن کے جنگلات دونوں طرف شروع ہو گئے اور ہم تقریباً ۱۲ میل سندربن کے گھنے جنگلات کے تہہ در تہہ سلسلوں کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

سندربن دنیا کے چند مشہور جنگلوں میں سے ایک ہے زمانۂ طالب علمی میں اس جنگل کی خصوصیات تاریخ کی کتابوں میں پڑھی تھیں آج اپنی آنکھوں سے اس کی خوبصورتی، دلفریبی اور رعنائی کو دیکھ لیا سندربن تقریباً چار ہزار مربع میل میں دریائے گنگا کے ڈیلٹائی علاقے میں خلیج بنگالہ تک پھیلا ہوا ہے اور نصف سے زائد پاکستان کے حصے میں آیا ہے۔ بقیہ بھارت میں ہے۔ لانچ میں سفر کرتے ہوئے حد نگاہ تک طویل قامت اور گھنے درختوں کا

سلسلہ نظر آتا ہے۔ کیچڑ اور دلدل کے سبب یہ جنگل ناقابل گذر ہے
شکاری یا اس جنگل سے لکڑی حاصل کرنے والے بندوقیں اور
سامان خورد و نوش لے کر پوری تیاری کے ساتھ یہاں آتے ہیں۔ کیونکہ
یہ خوبصورت اور ہیبتناک جنگل نہ صرف مشہور عالم "رائل بنگال ٹائیگر" کا
مسکن ہے، بلکہ یہاں زہریلے سانپ، خطرناک بندر، مگرمچھ، اژدہے
خوفناک تیندوے اور بھیڑیئے وغیرہ بستے ہیں اور کسی وقت بھی
غیر مسلح انسانوں کا صفایا کر سکتے ہیں۔ سندر بن میں جانے کے لئے
صرف چھوٹے چھوٹے نالے اور ندیاں ہیں جن میں ہلکی پھلکی کشتیاں
آجا سکتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سندر بن میں ایک ہزار سے زائد
شیر موجود ہیں جن میں سے ۹۰ فیصدی آدم خور ہیں۔ یہاں کا شیر
سلہٹ کے چیتوں سے جسامت میں کچھ چھوٹا ہے لیکن بے حد
خطرناک ہے۔ لیکن تمام خطرات کے باوجود یہ جنگل پاکستان کی
ایک بڑی دولت بھی ہے اس جنگل کا شہد دور دور تک
مشہور ہے اور حکومت مشرقی پاکستان کوشش کر رہی ہے کہ
اس جنگل سے شہد زیادہ سے زیادہ مقدار میں حاصل کر کے زرمبادلہ
کما سکے، شہد اور موم کے علاوہ گیوا لکڑی کے یہاں وسیع ذخائر
ہیں۔ یہ لکڑی نیوز پرنٹ کے علاوہ دیا سلائی بنانے کے کام بھی آتی ہے

گیوا کے علاوہ یہاں ایک اور مشہور درخت سندری بھی پایا جاتا ہے جس کی بلندی تقریباً ۵۰ فٹ اور گولائی ۳½ فٹ ہے۔ اس کی لکڑی مکانوں کی تعمیر میں کام آتی ہے اور اس سے کشتیاں بھی بنائی جاتی ہیں۔ ایک اور درخت جسے گول پتہ کہتے ہیں یہاں کثرت سے پایا جاتا ہے۔ اس درخت کے پتے پنکھے کی طرح گول ہوتے ہیں اور دیہاتوں میں بسنے والے ان گھنے پتوں سے مکانوں کے چھپر بناتے ہیں۔ توقع ہے کہ اس جنگل سے ابھی کئی اور مفید چیزیں دستیاب ہوں گی۔

ذاکر علی اور شریف المجاہد سندربن میں جانے کے لئے بے چین تھے، اشتیاق بے حد تھا لیکن مولانا خیری اور انصاری صاحب کی رائے تھی کہ بغیر ہتھیار کے جنگل میں جانا خالی از خطرہ نہیں کافی ردو قدح کے بعد یہ طے پایا کہ جنگل میں زیادہ دور تک نہیں جائیں گے۔ کنارے سے قریب ہی رہیں گے۔ چنانچہ لانچ سندربن سے قریب دریا کے ایک کنارے لاکر کھڑی کر دی گئی۔ پھر ایک درخت میں رسّہ ڈال کر اُسے دلدلی ساحل کے قریب لایا گیا اور ایک ایک کرکے سب سندربن کے جنگل میں کود گئے۔ ہم سب نے چاہا کہ مولانا صاحب لانچ ہی میں رہیں لیکن وہ جرأت اور حوصلے میں ہم میں سے کسی سے کم نہ تھے

چنانچہ نہ مانے اور ہمارے ساتھ آ گئے۔ سعید الرحمٰن نے فوراً ہمارا گروپ فوٹو لے لیا تاکہ یہ سفر ہمیشہ یادگار رہے۔ زمین کی کیچڑ اور دلدل میں زیادہ دور تک جانا ممکن نہ تھا۔ حتیٰ کہ کانٹے دار جھاڑیوں اور چھتنار درختوں میں پچاس قدم سے آگے کچھ نظر بھی نہ آتا تھا بمشکل دس منٹ درختوں کا سہارا لے کر کچھ دور گئے اور پھر لانچ پر واپس آ گئے۔ قیوم ملک بچاری بھرکم انسان ہیں۔ ان کے جوتے کیچڑ میں بھر گئے تھے۔ لانچ پر آتے وقت اتفاقاً ان کا پیر پھسل گیا۔ وہ پانی میں گر پڑتے لیکن انصاری صاحب نے بڑھ کر فوراً سنبھال لیا خدا نے بڑی خیر کی۔

ڈیڑھ بجے کے قریب ہم واپس ہوئے۔ افضل حسین نے لانچ ہی میں کھانے کا انتظام کیا تھا۔ مولانا خیری خاص دلی کے ہیں اور دہلی والے کھانے کے معاملے میں لکھنؤ والوں سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں، مرغی اور مچھلی کے علاوہ انناس اور آم بھی کھانے میں موجود تھا۔ شرقی پاکستان آئے ہوئے ہمیں پانچ چھ دن ہو چکے تھے اور اس عرصے میں ہم سب ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے تھے۔ ہر کھانے کے بعد مولانا خیری افضل حسین کو نمبر دیا کرتے تھے۔ لانچ میں جو کھانا ہم نے کھایا وہ خاصا اچھا

تھا۔ لیکن مولانا صاحب نے افضل حسین کو دس میں سے صرف سات ہی نمبر دیے۔ واپسی میں کچھ دیر تاش بھی کھیلے گئے انصاری صاحب سہارن پور کے نکلے اور ۶، ۷ گھنٹے کے سفر میں اپنی دلچسپ باتوں سے انھوں نے ہمیں اپنا گرویدہ بنا لیا۔ لانچ کا چلانا کچھ مشکل نہ تھا۔ چنانچہ میں نے وقت گذاری کیلئے کافی دیر لانچ بھی چلائی۔ طویل دریائی سفر تھکا دیتا ہے۔ لیکن ہم ۸، ۹ افراد تھے۔ ہنستے بولتے ۵ بجے کے قریب کھلنا پہنچ گئے۔ انصاری صاحب کا اصرار تھا کہ ہم ان کے گھر پر چلیں۔ چنانچہ لانچ پر ہی کھلنا سے ہم خالص پور گئے جو زیادہ دور نہ تھا۔ تقریباً دو گھنٹے انصاری صاحب کے مکان پر گذارے۔ انھوں نے نہایت محبّت سے خاطر مدارات کی۔ اور سات بجے ہمیں سامان سمیت راکٹ اسٹیمر پر پہنچا دیا۔

موسیٰ احمد صاحب نے راکٹ اسٹیمر کا سفر بطور خاص ہمارے پروگرام میں شامل کیا تھا۔ انھوں نے بتایا تھا کہ یہ سفر نہایت دلچسپ ہوگا۔ یہ اسٹیمر نہایت تیز رفتار ہے اور کئی اہم شہروں سے گذرتا ہے۔ جب ہم لانچ سے راکٹ اسٹیمر پر پہنچے تو اس میں کافی مسافر اور سامان تجارت لدا تھا۔ اس اسٹیمر کا نام کیوی تھا

لیکن یہ اسٹیمر دراصل ایک بڑا جہاز تھا اور ضرورت کی ہر چیز اس میں دستیاب تھی۔ ۸ بجے شب گورا کٹ اسٹیمر نے حرکت کی دریائی سفر شروع کر دیا۔ اسٹیمر کے اوپری حصے میں ہماری نشستیں محفوظ تھیں۔ ایک کیبن میں دو افراد تھے۔ سفر کے آغاز سے میرا اور مولانا خیری کا ساتھ تھا۔ دوسرے کیبن بھی قریب ہی تھے ۹ بجے ہم نے کھانا کھایا۔ پھر کیبن کے سامنے برآمدے میں کرسیاں ڈال کر چاندنی رات اور تیز رفتار راکٹ اسٹیمر کے سفر کا دیر تک لطف اٹھایا۔ دن بھر ہم نے لانچ میں سفر کیا تھا اور اب ساری رات اور کل سہ پہر تک ہمیں راکٹ میں سفر کرنا تھا ہوا چونکہ مخالف تھی اس لئے جب ہم کیبنوں میں سونے کے لئے پہنچے تو خاصی گرمی تھی۔ کیبن کا پنکھا چلایا لیکن پنکھے کی ہوا بھی گرم تھی۔ جوں توں رات کٹ گئی۔

باریسال، چاند پور، غفار گاؤں

جمعرات ——— ۲۲ جون

ذاکر صاحب نے بہت سویرے ہم سب کو بیدار کر دیا اور جب ہم اپنی کیبنوں سے برآمدے میں آئے تو قدرت کے حسین مناظر نے ہمیں مبہوت کر دیا۔ دریا کے چوڑے سینے پر راکٹ اسٹیمر پوری رفتار سے جا رہا تھا اور سورج کی کرنوں سے دریا میں سونا بہہ رہا تھا، دریا کے دونوں طرف ہرے بھرے کھیتوں اور آبادیوں کے سلسلے نظر آ رہے تھے اور کناروں کے آس پاس دور دور تک چھوٹی بڑی کشتیوں کے بادبان عجیب سماں پیدا کر رہے تھے۔

ہمارے اسٹیمر کی پہلی منزل باریسال تھا۔ یہاں نصف گھنٹہ ہم نے قیام کیا کچھ مسافر اتر گئے۔ کچھ نئے آگئے۔ پتہ چلا کہ باریسال اور دوسرے شہروں کو ملانے کا واحد ذریعہ دریائی سفر ہے۔ نہ یہاں تک ریل آسکی ہے نہ کوئی ہوائی اڈہ ہے۔ پھر بھی اس علاقے کا یہ اہم تجارتی شہر ہے، اور چاول کی پیداوار کے لئے مشہور، شیر بنگال اے، کے فضل الحق مرحوم بھی اسی شہر میں پیدا ہوئے تھے۔ اس نسبت سے بھی باریسال کی اہمیت مسلمہ ہے۔

باریسال سے روانہ ہو کر ہم ۱۲ بجے دن کو چاند پور پہنچے جہاں سے کچھ دور مشرقی پاکستان کے دو مشہور دریا پدما (یا پدّا) اور میگھنا ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ مشرقی پاکستان کے ہر دریا کی اپنی خصوصیات اور روایات ہیں اور ان کے اثرات یہاں کی تہذیب و ثقافت اور ادب وفن میں بھی پائے جاتے ہیں۔ تقریباً یہاں کے سبھی دریا اس سرزمین میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک نغمے الاپتے اور یہاں کے عوام کو زندگی، توانائی، حرارت اور روشنی کا پیغام دیتے ہیں۔

دنیا کے بڑے دریا پدما یا پدّا جو پاکستان کی سرحد پر، گداگری کے گھاٹ

(حاشیہ دوسرے صفحہ پر دیکھئے)

سے داخل ہوتا ہے۔ دراصل گنگا کی ایک شاخ ہے۔ دوسری شاخ جو بھارت میں ہے "بھاگیرتی" کہلاتی ہے یہ دریا راج شاہی سے بہتا ہوا کشتیا، پبنا، فرید پور اور ڈھاکہ سے ہوتا ہوا چاندپور کے قریب دریائے میگھنا سے مل کر سمندر کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس جگہ دریا کی چوڑائی ۲۵ میل ہے۔ یہ دریا پاکستان میں پچاس میل تک سرحد بناتا ہے اور کسی جگہ بھی اس کی چوڑائی ۵ میل سے کم نہیں۔ اس میں صرف اسٹیمر، ناؤ اور کشتیاں ہی نہیں۔ بڑے بڑے جہاز بھی چلتے ہیں جو ہزاروں من سامان لاتے اور لے جاتے ہیں۔

---

[1] یہ دریا صدیوں سے بنگال میں آنے جانے کا ایک بڑا ذریعہ رہا ہے۔ اندرون ملک تجارتی سامان بھی اسی راستے سے آتا جاتا تھا۔ پندرھویں صدی میں چین کے جو سفیر بنگال کے مسلم حکمرانوں کے دربار میں آئے ان میں ایک سفیر مہوان بھی تھا جس نے بنگال کے باشندوں کے رسم و رواج، زبان، لباس اور رہن سہن کے بارے میں تفصیلی حالات لکھے ہیں۔

یہ دریا اپنے کناروں کو کاٹ کر کئی بستیوں اور شہروں کو نیست و نابود کر چکا ہے۔ سری پور عیسیٰ خاں کا دارالحکومت تھا اور بکرم پور جو ایک مشہور شہر اور راجہ راج بلبھ کا دارالحکومت تھا دریائے پدما ان کے نام و نشان تک مٹا چکا ہے۔

پاکستان کی سرسبزی اور شادابی میں اس دریا کا بڑا حصہ ہے، بہاؤ کے ساتھ یہ دریا نہایت زرخیز مٹی لاتا ہے اور سیلاب کے زمانے میں پھیلا دیتا ہے۔ پٹ سن اور چاول کی پیداوار کے علاوہ اس دریا کے سبب ماہی گیری اور ملاحی سے لاکھوں افراد اپنی روزی پیدا کرتے ہیں، ہلسا مچھلی کا نام اور اس کی شہرت ہم نے سُنی تھی۔ اب پتہ چلا کہ ہلسا مچھلی اسی دریا کی پیداوار ہے۔ اس کے کنارے دور دور تک آبادی ہے اور یہاں کے رہنے والے دودھ، گھی، پنیر، دہی اور مٹھائی کی تجارت کرتے ہیں اس دریا کے چاروں طرف کیلے اور انناس بھی کثرت سے پیدا ہوتے ہیں اور لاکھوں افراد کی گذر بسر کا ذریعہ مہیا کرتے ہیں۔ لیکن جب برسات شروع ہوتی ہے اور سیلاب کا زور بڑھتا ہے تو یہی دریا تباہی اور بربادی کا سبب بن جاتا ہے کناروں کی بستیاں، آم اور کٹھل کے باغ میدان اور کھیت اسکی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ کسان جلد سے جلد اپنی فصلیں کاٹنے کے لئے سرگرمی سے کام کرتے ہیں سیلاب کے زمانے میں شہروں کا مال دور دور کے چھوٹے چھوٹے گاؤں میں بآسانی پہنچ جاتا ہے۔ دیہات کے لوگ اپنی ناؤ میں ضروری سامان لاتے لیجاتے

ہیں۔ خصوصاً جنگلوں کی کٹی ہوئی لکڑی اسی زمانے میں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جائی جاتی ہے۔

پدما کے جلال و جمال نے رابندر ناتھ ٹیگور کو بھی مسحور کر دیا تھا۔ اسی دریا کے طفیل ہمیں ٹیگور کا مشہور ناول "ناؤ کا ڈوبی" نصیب ہوا۔ یہی نہیں بلکہ ان گنت افسانے اور نظمیں بھی اس دریا سے منسوب ہیں۔ پدما ندی — کنارے — ٹیگور کی ایک مشہور نظم ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو ؎

غصیلے بادل جنگل کے تاریک اُفق پر جمع ہو رہے ہیں، ہمبر چاند باہر نہ جا
جھیل کے ساحل پر ناریل کے درختوں کی قطاریں
اندھیرے آسمان سے اپنا سر ٹکراتی ہیں۔
بھیگے ہوئے پروں والے کوّے
املی کی شاخوں پر چپ چاپ بیٹھے ہیں
دریا کا مشرقی کنارا
ہیبت ناک تاریکی میں ڈوب گیا۔
کھونٹے سے بندھی ہوئی ہمارے گائے
زور زور سے ڈکرا رہی ہے
مُنّے — میرا انتظار کر۔

تاکہ میں گائے کو اندر تھان پر لے آؤں۔

اسی نظم کا ایک اور اقتباس دیکھئے۔ جس میں ٹیگور نے اپنی خلّاقی سے بارش کے بعد کی کیفیات کی کتنی سچّی اور اثر انگیز تصویر کشی کی ہے ؂

میرے بچے — باہر مت جا
ہاٹ کی سڑک سنسان ہے اور ندی کی اور جانے والی گلی میں
قدم پھسل پھسل جاتے ہیں۔
جال میں پھنسے ہوئے وحشی جانور کی مانند
ہوا بانس کے جھنڈ میں چیخ رہی ہے۔
بارش بہت زور سے برسی
دریا نے جزیرے کو نگل لیا۔
اور میں ڈوبتے ہوئے ساحل پر
اناج کا گٹھا سنبھالے
تنہا بارش تھمنے کا انتظار کرتا رہا۔

پدما سے مشرقی پاکستان کے مختلف علاقوں میں جانے کے دو بڑے مراکز ہیں — ایک گوالندو جہاں برہمپترا۔ پدما میں گرتا ہے اور دوسرا چاند پور میگھنا پدما سے ملتا ہے، چاند پور سے

چاٹگاؤں، باریسال، سلہٹ اور کومیلا وغیرہ کو راستہ جاتا ہے ریل اور ہوائی جہاز کی سہولتوں کے باوجود یہ دریا آج بھی مشرقی پاکستان کا سب سے بڑا سفری راستہ ہے۔

پدما کی طرح دریائے میگھنا[1] بھی چند در چند خصوصیات کا حامل ہے اور عوام کی خوشی اور خوشحالی میں برابر کا شریک آسام کے کھاسیا پہاڑ سے دو ندیاں سورما اور برنائی نکلتی ہیں۔ یہ ندیاں مشرقی پاکستان میں داخل ہوتے ہی ایک ہو جاتی ہیں اور میگھنا کہلاتی ہیں۔ دریائے بھیرب کے قریب میگھنا برہماپترا سے مل جاتا ہے۔ پھر آگے بڑھ کر چاندپور

---

[1] کہا جاتا ہے کہ ۱۸۶۷ء میں اس دریا میں زبردست طوفان آیا تھا پانی چالیس پینتالیس فٹ تک اچھلا اور ہاتیا کا پورا جزیرہ غرقاب ہو گیا۔ پھر ۳۱ اکتوبر ۱۸۷۶ء کو اس سے بھی بڑا طوفان آیا۔ جس سے نواکھالی کا کچھ حصہ اور سندیپ کا جزیرہ ڈوب گیا۔ لاکھوں چرند، پرند اور انسان لقمۂ اجل بن گئے۔ میگھنا کی ان ہولناکی کے باوجود وہ یہاں کا پسندیدہ دریا ہے اس دریا کا پاٹ اتنا چوڑا ہے کہ ایک کنارے سے دوسرا کنارہ نظر نہیں آتا۔ پدما کی طرح میگھنا بھی یہاں کے ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کی تخلیقات کا موضوع بنا رہا ہے۔

کے قریب پدما میں شامل ہو کر بہتا اور سندیپ کے آس پاس خلیج بنگالہ کی وسعتوں میں گم ہو جاتا ہے پدما اور میگھنا کا ملاپ کا منظر دیکھنے سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ پدما کا کھلا ہوا پانی اور میگھنا کا نیلا شفاف پانی واضح طور پر علیحدہ نظر آتا ہے۔

چاندپور مشرقی پاکستان کا ایک بڑا اور اہم کاروباری شہر ہے یہاں ہمارا اسٹیمر کافی دیر ٹھہرا سامان اور مسافروں کے اُترنے اور نئے مسافروں کے سوار ہونے تک گھاٹ پر بڑی رونق اور چہل پہل دیکھنے میں آئی سامان لانے اور لیجانے والے بچے اور جوان دریا میں تیر کر اسٹیمر پر چڑھ آئے تھے اور مسافروں کا سامان سروں پر لے جا رہے تھے۔ اسٹیمر کے قریب کشتیاں بھی آن لگی تھیں اور مسافروں کو گھاٹ پر پہنچا کر نئے مسافروں کو لا رہی تھیں۔ گھاٹ پر کئی تجارتی جہاز بھی ہمیں نظر آئے جن سے اس شہر کی تجارتی اہمیت کا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا۔

تقریباً ۱۱ بجے ہمارا اسٹیمر روانہ ہوا اور دو گھنٹے سے بھی کم وقت میں نرائن گنج پہنچ گیا۔ ہمیں یہیں اترنا تھا۔ سامان لے کر اسٹیمر سے اترے اور نرائن گنج ریلوے اسٹیشن پر آگئے جو گھاٹ سے متصل ہی تھا۔ پلیٹ فارم پر میمن سنگھ جانے والی ٹرین تیار

کھڑی تھی۔ اس گاڑی میں ہماری نشستیں محفوظ نہ تھیں اس لئے
کچھ دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پوری ٹرین میں صرف ایک فرسٹ
کلاس اور ایک سیکنڈ کلاس ڈبہ تھا۔ ہم سب بدقت سیکنڈ
کلاس میں سوار ہوئے۔ اس وقت شام کے چار بج رہے تھے
لیکن سخت گرمی تھی۔ جیسور سے بھی زیادہ۔ مسافروں سے
ڈبہ کھچا کھچ بھرا تھا۔ کچھ ساتھی بیٹھ سکے۔ کچھ نے کھڑے کھڑے سفر
کیا۔ نرائن گنج سے روانہ ہو کر ٹرین ڈھاکہ اسٹیشن پر رکی۔ اور
ہمارے ڈبے کے کئی مسافر یہاں اتر گئے۔ اسٹیشن پر سید احمد
صاحب، ڈائرکٹر تعلقات عامہ، رستم علی صاحب اور صدیقی
صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں
رستم علی صاحب نے ہماری ڈاک اور دھلے ہوئے کپڑے حوالے
کئے۔ اور ٹرین روانہ ہو گئی۔ اب ہمارے ڈبے میں زیادہ بھیڑ
نہ تھی۔ موسم بھی خوشگوار ہو گیا تھا۔ سورج غروب ہونے
تک ٹرین کے دونوں طرف حد نگاہ تک سرسبز و شاداب زمینیں
کھیت، گھنے درخت، تالاب اور باغات نظر آ رہے تھے!

میرے لئے سفر در سفر کا یہ پہلا دلچسپ تجربہ تھا۔ کل سارا
دن ہم نے سندربن دیکھنے کے لئے لانچ میں سفر کیا تھا اور تمام

رات اور دن کا بڑا حصہ ہمارا اسٹیمر پر گذرا تھا۔ دریاؤں کی وسعتوں سے گذر کر اب ہمارا قافلہ سرزمین مشرقی پاکستان کے ایسے شاداب علاقوں سے گذر رہا تھا۔ جو ہم نے پہلی بار دیکھے تھے دریائی مناظر سے یہ مناظر قطعی مختلف تھے لیکن ان کی حسن آفرینی اور سحر آگین سے انکار کی کسے جرأت تھی؟ — اندھیرا ہوتے ہی حسین مناظر تاریکی میں روپوش ہو گئے اور ہماری ٹرین پوری رفتار سے اپنی منزل کی طرف بھاگتی رہی۔ ۹ بجے کے قریب ایک اسٹیشن آیا۔ اس اسٹیشن پر بے پناہ مجمع تھا۔ کھڑکیوں سے ہم نے جھانک دیکھا تو اسٹیشن روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ کسی نے بتایا کہ یہ غفار گاؤں ہے۔

جم غفیر کو دیکھ کر ہم میں سے کسی نے کہا۔ شاید حاجی صاحبان آئے ہوں گے یا کوئی بڑا سرکاری افسر ہوگا لیکن گاڑی رکتے ہی ہماری حیرت اور مسرت کی انتہا نہ رہی جب ہمیں علم ہوا کہ غفار گاؤں کے عوام اور پریس کلب کے نمائندے ہمارے استقبال کے لئے یہاں آئے ہیں۔ دو تین حضرات بھاگتے ہوئے ہمارے ڈبے کی طرف آئے اور ہمیں پلیٹ فارم پر لے گئے جہاں میزوں پر پھل فواکہات اور پھولوں کے گلدستے سجے ہوئے تھے اور چائیں

طرف سینکڑوں افراد کا اجتماع تھا۔ نورالہدیٰ صاحب صدر پریس کلب غفار گاؤں نے مختصر تقریر میں ہماری آمد پر دلی مسرت کا اظہار کیا اور مغربی پاکستان کے بھائیوں کے نام محبت اور خیر سگالی کا پیغام دیا۔ ہماری نمائندگی مولانا رازق الخیری نے کی اور اس پرخلوص استقبال کا دلی شکریہ ادا کیا۔ پھر رس گلوں اور پھلوں سے ہماری تواضع کی گئی۔ پھر چائے آگئی اور رخصت ہوتے ہوئے پریس کلب کے سیکرٹری عبدالباری صاحب نے ہمیں پھولوں کے حسین گلدستے پیش کئے۔ یہ سب کچھ چند منٹ میں ہوا۔ لیکن اس چند منٹ کے یادگار استقبال نے محبت کا جو نقش چھوڑا ہے وہ کبھی فراموش نہ ہوگا۔ ہم اُن نورانی سادہ و معصوم بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کے چہرے کبھی نہیں بھول سکیں گے جو ہماری محبت میں غفار گاؤں کے اسٹیشن پر جمع ہوئے تھے۔ یہی وہ عوام ہیں جن کے خون پسینے سے پاکستان کی عمارت بنی ہے۔ یہ صرف غفار گاؤں کے عوام نہیں۔ یہ سارے پاکستان کے عوام ہیں۔ ٹرین کی روانگی کے وقت جس محبت اور خلوص سے ہاتھ ہلا ہلا کر غفار گاؤں کے رہنے والوں نے ہمیں رخصت کیا ہے۔ یہی ہاتھ پاکستان کی اصلی طاقت ہیں۔ اور جس جذبۂ محبت سے انھوں نے

ہمیں گلدستے پیش کیے ہیں۔ یہی جذبہ پاکستان کی تقدیر ہے جس کے صحیح وارث یہی عوام ہیں۔ ان ہاتھوں کو۔ ان جذبات کو کبھی فنا نہیں۔ دوری اور فاصلہ اور سیاسی ریشہ دوانیاں بھی عوام کے ازلی رشتوں کو کبھی ختم نہیں کر سکتیں!

دس بجے کے قریب میمن سنگھ آگیا۔ فضل الرحمٰن صاحب ڈویژنل پبلک ریلیشن آفیسر جو غفار گاؤں سے ہمارے ساتھ آئے تھے اسٹیشن سے ہمیں سرکٹ ہاؤس لے گئے جہاں ہمارے قیام و طعام کا انتظام تھا۔



فن سنگ تراشی کا ایک نادر نمونہ
(میہن سنگھ)



سلہٹ میں چائے کا ایک باغ اور دو محنت کش عورتیں



بڑھاپا اور جوانی



بلبل اکیڈیمی کے زیر اہتمام — مشرقی پاکستان کے عوامی رقص کا ایک منظر



مغربی پاکستان کے ادیب و صحافی گارو قبیلہ کے چند افراد کے ساتھ



چکمآ قبیلہ کی عورتیں اور مردؔ اپنے مخصوص لباس میں



ادیب و صحافی - سندر بن کے ایک گنجان علاقے میں



میمن سنگھ ریسٹ ہاؤس میں
(دائیں سے بائیں) افضل حسین ، شریف المجاہد ، قیوم ملک
صہبا لکھنوی اور فضل الرحمن

میمن سنگھ

جمعہ ـــــــ ۲۳ جون

میمن سنگھ کی رات گرم تھی۔ پھر بھی لگاتار سفر کے باعث کھانے سے فراغت کے بعد جلد ہی نیند آگئی۔ ہم علی الصبح بیدار ہو گئے۔ فضل الرحمٰن صاحب جیپ گاڑیاں لے کر آگئے تھے چنانچہ ناشتے کے بعد سب سے پہلے نیشنل بنک کی عمارت دیکھنے گئے جو قدیم طرز تعمیر کا ایک اچھا نمونہ تھی۔ معلوم ہوا یہ عمارت کسی ہندو زمیندار نے بنوائی تھی۔ وہاں سے ٹیچرس ٹریننگ کالج برائے خواتین پہنچے۔ کالج میں تعطیلات تھیں، لیکن یہ عمارت بھی طرز تعمیر

کے لحاظ سے پرکشش تھی۔ عمارت کے وسیع میدان میں سنگ مرمر سے تراشا ہوا عورت کا ایک حسین مجسمہ استادہ تھا۔ یہ مجسمہ بلاشبہ فن سنگتراشی کا شاہکار تھا اسی نوع کا ایک مجسمہ سرکٹ ہاؤس کے لان میں بھی سویرے ہم نے دیکھا تھا۔ پتہ چلا یہاں کے ہندو زمیندار عمارتوں کی تزئین و آرائش اور فنون لطیفہ کا خاصا اچھا ذوق رکھتے تھے اور یہ نادر نمونے وہی چھوڑ کر گئے ہیں، ٹریننگ کالج کی عمارت کا نام ،،شانتی لاج ،، تھا اور یہ میمن سنگھ کی مشہور اور خوبصورت عمارتوں میں شمار کی جاتی ہے۔ خواتین کے کالج میں اس مجسمے کو دیکھ کر مولانا خیری بھی معترض تھے اور مولانا ذاکر بھی۔ ان کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ خواتین کا کالج اس مجسمے کے لئے قطعی موزوں نہیں۔ اور جب قیوم ملک شریف المجاہد اور میں نے اس مجسمے کے ساتھ تصویر کھنچوائی تو دونوں حضرات علیحدہ ہو گئے۔ لیکن تبادلۂ خیال کے دوران ان دونوں حضرات نے اس بات پر اتفاق کیا کہ یہ مجسمے فنی کمال کا بہترین نمونہ ہیں اور ان میں صرف جان پڑنے کی دیر ہے۔ مجسموں کی تراش خراش کو دیکھ یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ ان مجسموں میں یونانی حسن کی کارفرمائی ہے جو بیک نظر

ہر انسان کو مبہوت کر دیتا ہے۔

زراعتی کالج

ٹریننگ کالج سے روانہ ہو کر ہم یہاں کا مشہور زراعتی کالج دیکھنے گئے۔ مسٹر علی پرنسپل نے ہمارا خیر مقدم کیا اور وسیع و عریض کالج کے متعدد شعبے، تجربہ گاہیں، زراعتی پیداوار اور پرورش حیوانات کے مرکز اور لائبریری وغیرہ دکھائی۔ ایک گھنٹے سے زائد ہم وہاں رہے۔ مسٹر علی نے بتایا کہ اس وقت ۵۷۳ طلباء کالج میں زیر تعلیم ہیں۔ ان طلباء میں سیاون اور برما کے نوجوان بھی ہیں۔ ایشیا میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا کالج ہے اور آئندہ سال زراعتی یونیورسٹی[1] میں تبدیل ہو جائے گا۔ یہاں علم زراعت اور علم حیوانات کی تعلیم کا مکمل انتظام ہے۔ ہوسٹل کے علاوہ اسٹاف کے لئے رہائشی کوارٹر بھی یہاں موجود ہیں۔ یہ کالج ۱۹۵۷ء میں قائم ہوا تھا۔

یونین کونسلیں

اگریکلچرل کالج سے رخصت ہو کر ہم دریائے برہمپترا پر پہنچے اور

---

[1] یہ کالج زراعتی یونیورسٹی میں تبدیل ہو چکا ہے۔

اور بڑی کشتیوں میں جیپ گاڑیوں سمیت دریا پار کیا۔[۵۲] دریائے برہمپترا مشرقی پاکستان کے مشہور دریاؤں میں سے ایک ہے، یہ دریا تبت سے نکلتا ہے اور مختلف جگہوں پر اس کے مختلف نام ہیں۔ تقریباً نو سو میل کی مسافت طے کر کے برہمپترا سعدیا (جسے شادیا بھی کہتے ہیں) کے قریب آسام میں داخل ہوتا ہے اور آسام سے آگے بڑھ کر جب یہ دریا مشرقی پاکستان میں داخل ہوتا ہے تو اس کی دو شاخیں ہو جاتی ہیں۔ ایک شاخ ضلع میمن سنگھ کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔ یہ شاخ اب سوکھ چکی ہے۔ دوسری شاخ جمنا کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ضلع ڈھاکہ اور میمن سنگھ کی مغربی سرحد سے گذر کر گوالندو کے قریب پدما سے مل جاتی ہے دریائے برہمپترا کی کئی شاخیں برسات میں بھرپور رہتی ہیں لیکن گرمیوں میں خشک ہو جاتی ہیں۔ اس دریا کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے کنارے کی زمین برابر کٹتی رہتی ہے اور دوسرے کنارے پر نئی زمین ابھر آتی ہے۔ اس کا دھارا بہت تیز ہوتا ہے اور دھارے کی تیزی

---

[۵۲] کشتیوں سے فی جیپ تین روپے اور فی بس دس روپے کرایہ ہے۔

سے مٹی ادھر سے ادھر ہوتی رہتی ہے جس کے سبب اس کے بیچ میں اکثر بڑے بڑے جزیرے بن جاتے ہیں۔ ان جزیروں کو یہاں چر کہتے ہیں۔ ان میں بعض جزیرے تو کئی کئی میل لمبے اور چوڑے ہوتے ہیں۔ مشرقی پاکستان کے جنوبی علاقوں کی سیرابی میں اس دریا کا بڑا حصہ ہے اس کے ذریعہ باہر کے ملکوں سے نمک لوہا اور دوسری چیزیں آتی ہیں اور چاول، پٹ سن، سبزیاں وغیرہ دوسرے ملکوں کو بھیجی جاتی ہیں، دریا کے کناروں پر ہمیں پکی عمارتیں بہت کم نظر آئیں۔ معلوم ہوا اس کا سبب دریا کے وہ کنارے ہیں جو برابر کٹتے رہتے ہیں۔ یہاں عام طور پر ٹین کے مکانات ہم نے دیکھے جن کے اندرونی حصے کھلے ہوئے تھے تاکہ سیلاب کا پانی آسانی سے گذر سکے۔

دریائے برہمپترا پار کرلے کے بعد ہم پھر جیپ گاڑیوں میں روانہ ہو گئے۔ چند میل کے بعد تارا گنڈ اور پھول پور کی یونین کونسلوں کے دفتر میں چائے اور مٹھائی سے ہماری خاطر مدارات کی گئی۔ قریب و دور کے سیکڑوں محنت کش عوام کو پہلی بار ہم نے قریب سے دیکھا اور ان سے تبادلۂ خیال کیا۔ ہمیں یہ جان کر بے اندازہ مسرت ہوئی کہ اس علاقے کے رہنے والوں نے بنیادی جمہوریت

کے نظام کو صحیح معنوں میں عملی جامہ پہنا کر سارے علاقے کے لئے
خوشحالی اور آسودگی کے اسباب فراہم کر لئے ہیں۔ پتہ چلا کہ
مشترکہ مساعی سے یہاں تھوڑے ہی عرصے میں سیڈ اسٹور،
پولٹری فارم، مچھلی فارم، کاشتکاروں کا کلب، نرسری گارڈن
ڈسپنسری، تعلیم بالغان کا مرکز، بچوں کے لئے دینی مدرسہ، اور
اسکول وغیرہ قائم ہو چکے ہیں اور بلا امتیاز ہر فرد ان سے استفادہ
کر رہا ہے ہمیں بتایا گیا ہے کہ یونین کونسلیں سہ سالہ اور پنجسالہ
پروگرام بنا کر اپنے منصوبوں پر عمل کر رہی ہیں، عزیز الحق صاحب
ایس۔ڈی او اور قادر صاحب سرکل آفیسر کی نگرانی میں ۷، ۶ یونین
کونسلیں ہیں یہ دونوں حضرات تاراگنڈا سے ہمارے ساتھ تھے اور
مختلف کونسلوں کے چیرمین اور ممبر حضرات سے انھوں نے ہمیں
متعارف کرایا۔ پھول پور میں کونسل کے صدر بابو بھٹاچارجی
نے نہایت محبت سے آؤ بھگت کی، اُن کی شستہ اردو نے
ہم میں سے ہر ایک کو متاثر کیا۔ امداد باہمی کے جن زریں اصولوں پر یہاں
کام ہو رہا ہے اسے دیکھ کر جی خوش ہوا۔ دراصل نظام کوئی برا نہیں
نہیں ہوتا اچھائی برائی کا انحصار اسے برتنے والوں کی صلاحیت یا
عدم صلاحیت پر ہوتا ہے۔ دیہی ترقی میں بنیادی جمہوریت کے نظام

کی جتنی مکمل صحیح اور عملی شکل ہم نے میمن سنگھ کی یونین کونسلوں میں دیکھی۔ کسی دوسرے علاقے میں اس کی نظیر مشکل سے ہی مل سکے گی ویسے بھی میمن سنگھ مشرقی پاکستان کا سب سے بڑا ضلع ہے۔ جس کا رقبہ تقریباً پانچ ہزار مربع میل اور آبادی ۱۷ لاکھ سے زیادہ ہے مشرقی پاکستان میں جتنی پٹ سن پیدا ہوتی ہے اس کی نصف سے زائد اس ضلع میں پیدا ہوتی ہے۔

تقریباً ۱۲½ بجے ہم لوگ حلوا گھاٹ پہنچے اور ریسٹ ہاؤس میں قیام کیا۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ مسلمانوں کے علاوہ دیگر مذاہب کے لوگ بھی یہاں آباد ہیں۔ نماز جمعہ کا وقت قریب تھا اس لئے ہم سب وضو کر کے قریب کی مسجد میں پہنچے امام مسجد نے خطبہ سے پہلے بنگالی میں تقریر کی۔ اور نماز کے بعد اردو میں دعا مانگی۔ حلوا گھاٹ مشرقی پاکستان کا ایک اندرونی علاقہ ہے اور ڈھاکہ چٹاگانگ جیسے ترقی یافتہ شہروں سے کافی دور۔ پھر بھی یہاں بنگلہ کے ساتھ ساتھ اردو اچھی طرح بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

گارو قبیلہ

کھانے کے بعد گارو ہلز کا پروگرام بن گیا اور ہم لوگ

پھر جیپوں میں چل پڑے اس بار پختہ سڑک کے بجائے ہمیں کچے راستوں سے گذرنا پڑا۔ درمیان میں کئی چھوٹے بڑے گاؤں آئے اور جوں جوں ہم سرحد کی طرف بڑھتے گئے۔ آسام کی پہاڑیاں ہم سے قریب ہوتی گئیں۔ بالآخر سہ پہر کو ہم آسام کی سرحد کے قریب پہنچے۔ پتہ چلا یہاں آس پاس چھوٹے چھوٹے ٹیلوں پر کئی گاؤں آباد ہیں۔ ان گاؤں میں ہلداگھاٹ، کالما، سری بورڈی، درگاپور اور نالیتا باڑی وغیرہ قابل ذکر ہیں ان گاؤں میں دو مشہور قبیلے گارو اور ہیجنگ آباد ہیں۔ جن کی تعداد ۱۹۵۱ کی مردم شماری کی رو سے علی الترتیب ۴۸ ہزار اور ۳۵ ہزار ہے ۱۰ ہزار کے لگ بھگ دوسرے قبیلے آباد ہیں۔

بھوپن کرہ کے مقام پر ہم لوگ جیپ سے اتر گئے اور پیدل چل کر سڑک سے کچھ دور گارو قبیلے کے ایک مکان میں پہنچے۔ عزیز الحق صاحب ہمارے ساتھ تھے۔ انھوں نے رہبری کی اور گارو قبیلہ کے ایک نوجوان کو بھی ساتھ لے لیا۔ جب ہم مکان کے صحن میں پہنچے تو گھر کی عورتیں جو دستی کرگھوں پر سوت کات رہی تھیں ہمیں دیکھ کر جھونپڑی کے اندر چلی گئیں، البتہ قبیلے کے بچے اور جوان ہمارے اردگرد جمع ہو گئے۔ وہاں سعید صاحب نے قبیلے کے افراد کے ساتھ ہمارا گروپ فوٹو لیا۔ معلوم ہوا کہ ابھی تک

یہ لوگ نئی دنیا کی ہمہ گیر ترقیوں سے نابلد ہیں۔ ان کی اپنی دنیا ہے اپنی تہذیب ہے اپنے رسم و رواج ہیں۔ ان کی شکل و صورت بہت کچھ چینیوں سے ملتی ہے۔ عورتیں کافی صحت مند ہیں لیکن جوان نسبتاً کمزور۔ کہنے کو یہ ہندو ہیں لیکن ان کی بڑی تعداد عیسائی ہو چکی ہے اور عیسائی مبلغین برابر تبلیغ و اشاعت اور ان قبیلوں کو ممکنہ سہولت پہنچانے کے لئے سرگرم کار ہیں (کاش اسلام کے مبلغین بھی ان دور دراز علاقوں میں آنے کی زحمت اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا فرض انجام دینے کی ضرورت محسوس کرتے)

قبیلے کے مرد محنت و مشقت اور کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ عورتیں گھروں کو سنبھالتی ہیں اور کھیتی باڑی میں مردوں کا ہاتھ بھی بٹاتی ہیں۔ عورتوں کے مقابلے میں مرد آرام طلب ہیں، سور، گائے مرغی وغیرہ ان کی پسندیدہ غذا ہے۔ چاول کی دیسی شراب پیتے ہیں جسے "پوجائی" یا "چو" کہتے ہیں قبیلہ میں عورت کا درجہ بلند ہے وہی ساری جائداد کی مالک ہوتی ہے۔ میمن سنگھ کے میدانی علاقوں میں گارو قبیلہ کے لوگ نسبتاً اچھی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہیجنگ قبیلہ گارو قبیلہ کے مقابلے میں ترقی یافتہ ہے لیکن دونوں قبیلوں کے

کے لباس تقریباً یکساں ہیں۔ ہیجنگ لڑکیاں اپنے سینے پر ایک کپڑا لپیٹ لیتی ہیں لیکن گارو لڑکیاں کمر پر کپڑا لپیٹتی ہیں اور خاص قسم کے بلاؤز استعمال کرتی ہیں۔ پتہ چلا کہ اب ان قبیلوں کی بعض عورتیں ساڑھی پہننے لگی ہیں ہیجنگ قبیلہ کے لوگ گارو قبیلہ سے زیادہ جفاکش اور ترقی یافتہ ہیں، یہ نسبتاً خوشحال ہیں اور سادہ زندگی بسر کرتے ہیں ان دونوں قبیلوں کی زبان آسامی سے ملتی جلتی ہے یہ لوگ بنگلہ بھی بولتے ہیں۔ اگرچہ یہ قبیلے گھاس پھونس کے جھونپڑوں میں رہتے ہیں لیکن ان کے گھروں کی صفائی اور ستھرائی دیکھ کر شاید ہی کوئی انھیں غیر مہذب کہہ سکے۔ بلاشبہ دنیا نے ارتقا کی ان گنت منزلیں طے کرلی ہیں۔ لیکن یہ قبیلے جو پاکستان کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی دوسرے ناموں سے آباد ہیں۔ آج تک غیر مہذب کہلاتے ہیں لیکن سچ پوچھئے تو ان قبیلوں میں بھی تہذیب و تمدن کے نشانات ملتے ہیں۔

پروگرام کے مطابق ۶ بجے میمن سنگھ پریس کلب کے عصرانے میں ہمیں شرکت کرنا تھا اسلئے آس پاس کے علاقوں میں ہم نہیں جا سکے اور بھوبن کرہ سے واپس ہو گئے اس مقام سے بھارت کی سرحد کسی جگہ دو میل ہے اور کسی جگہ دو فرلانگ واپسی میں گارو اور ہیجنگ قبیلے کی کئی عورتیں اور مرد ہمیں نظر آئے

مرد تو ہماری جیپ کے گذرنے تک کھڑے رہے اور دلچسپی سے ہمیں دیکھتے رہے۔ لیکن عورتوں نے جو پانی کے گھڑے لئے یا نہا کر آرہی تھیں ہمیں دیکھ کر چھپنے کی کوشش کی۔ ان کا یہ اقدام فطری تھا۔ شرم و حیا عورت کا زیور ہے اس کے لئے مہذب اور غیر مہذب کی تخصیص نہیں۔

ہم اب تک مشرقی پاکستان کے کئی شہر، دیہات، قصبات اور دور دراز علاقے دیکھ چکے تھے۔ تقریباً بھی جملہ مرد اور عورتیں افلاس اور غربت کے باوجود ہمیں سادگی پسند، نیک نفس اور جفاکش نظر آئے۔ یہاں کے لوگوں میں عام طور پر مذہبی رجحانات اور حب الوطنی کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ دوران گفتگو ہمیں اس بات کا بھی اندازہ ہوا کہ عام تعلیم نہ ہونے کے باوجود یہاں کے عوام نہایت باشعور ہیں۔ ملک اور ملک کے مسائل سے انھیں کماحقہ، واقفیت ہے۔ کسی بھی نوزائیدہ ملک کی ترقی اور استحکام کے لئے عوامی بیداری ہمیشہ مثبت نتائج کی حامل ہوتی ہے۔ بشرطیکہ حکومت اور عوام میں قریبی رابطہ قائم رہے۔ یہ ایک کلیہ ہے۔

میمن سنگھ سے آسام کی سرحد تک اور سرحد سے میمن سنگھ

تک تقریباً ۹۰ میل ہم نے جیپ میں سفر کیا۔ لیکن تھکن کا ذرّہ بھر احساس نہ تھا۔ سورج غروب ہوتے ہوتے ہم میمن سنگھ پہنچ گئے اور سرکٹ ہاؤس ہو کر سیدھے پریس کلب گئے۔

پریس کلب اندرون شہر واقع ہے۔ دروازہ پر مسٹر رمانی سکریٹری پریس کلب کے علاوہ مدیران جرائد، صحافی، اخبارات اور خبر رساں ایجنسیوں کے نمائندوں نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ کچھ دیر بعد کاظمی صاحب ڈپٹی کمشنر بھی آ گئے وہ پریس کلب کے صدر بھی ہیں۔ ان کے ساتھ عطاء الرحمان جمیل انجنیر اور معین الدین صاحب ایس پی بھی تھے۔ عصرانہ شروع ہوا اور دوستانہ فضا میں ادب و صحافت کے مسائل پر بات چیت ہوتی رہی پتہ چلا کہ یہاں بنگلہ کے چار جرید ے شائع ہوتے ہیں۔ حال ہی میں روٹری کلب نے انگریزی کا ایک رسالہ نکالا ہے، کوئی روز آنہ اخبار نہیں۔ ڈھاکہ اور چٹاگاوں کے اخبارات یہاں کثیر تعداد میں آتے ہیں۔ مقامی اخبارات کی حالت اچھی نہیں۔ شریف المجاہد نے دوران گفتگو یہ تجویز پیش کی کہ اگر اخباری صنعت کی ترقی کے لئے حکومت مالی کارپوریشن کی طرح کوئی ادارہ قائم کر دے تو میمن سنگھ اور دوسرے اضلاع میں پریس اور

اخبارات کے لئے قرضے کی سہولت مل سکتی ہے۔ کاظمی صاحب نے بتایا کہ میمن سنگھ میں انھوں نے امداد باہمی کے اصولوں پر پریس کی تنظیم کی ہے اور توقع ہے کہ اس تنظیم سے پریس اور عوام کے درمیان قریبی رابطہ پیدا ہو سکے گا اور اس ضلع کے ترقیاتی منصوبوں کی جلد تر تکمیل ممکن ہوگی۔ کاظمی صاحب کے نام اور کام کی شہرت ہم نے سُنی تھی۔ یہاں اُن سے مل کر اور میمن سنگھ کے ترقیاتی کاموں کو دیکھ کر اس کی تصدیق ہو گئی۔! ۹ بجے کے قریب ہم لوگ سرکٹ ہاؤس پہونچے، کھانے سے فراغت کے بعد قیوم ملک، ذاکر علی، شریف المجاہد اور سعید الرحمن نے کچھ پرانے اور کچھ نئے لطیفے سنائے اور بعض لطیفوں کو روایتی انداز میں غریب سکھوں کے سر منڈھ دیا۔ مولانا افضل حسین اور میں لطف اندوز ہوتے رہے۔ سونے کے لئے جانے سے قبل جب افضل حسین نے مولانا سے میمن سنگھ کی مہمان نوازی اور کھانے کے انتظام کے سلسلے میں نمبر مانگے تو مولانا نے مسکراتے ہوئے دس میں سے صرف ساڑھے سات نمبر دیئے۔ میں نے پوچھا۔ مولانا دس میں سے دس کیوں نہیں۔ فرمایا۔ حلوا گھا کے کھانے کا انتظام اچھا نہیں تھا اسلئے ڈھائی نمبر کٹ گیا۔!

اب ہمارا سفر آخری مرحلوں میں تھا۔ پروگرام کے مطابق رات کو ۳½ بجے ہمیں ریل سے چاٹگام روانہ ہونا تھا۔ ۱۱½ بجے کے قریب نیند آئی۔ ۳ بجے سے کچھ پہلے فضل الرحمن صاحب سواری لے کر آگئے اور ہمیں بیدار کیا۔ سامان تیار ہی تھا۔ بستر باندھے اور اسٹیشن روانہ ہو گئے۔ گاڑی کافی لیٹ تھی۔ تقریباً ۵ بجے صبح ہم میمن سنگھ سے روانہ ہوئے۔ اب کچھ اجالا پھیل رہا تھا اور دور و نزدیک کے لہلہاتے کھیت اونچی نیچی پہاڑیاں، کچے پکے مکانات، ندیاں اور تالاب اور درختوں کے قطار اندر قطار سلسلے نظر آنے لگے تھے۔ ریل کے سفر میں مشرقی پاکستان کا قدرتی حسن انسان کا دل موہ لیتا ہے۔ بادِ سحر کے لطیف جھونکوں نے موسم کو نہایت خوشگوار بنا دیا تھا۔ ٹرین میں ہماری نشستیں پہلے سے مخصوص تھیں اور سلہٹ کے مقابلے میں اس گاڑی کے ڈبے بھی نئے تھے۔ ہم سب نے آرام سے اپنے بستر سیٹوں پر بچھا لئے اور دیر تک ان حسین مناظر سے لطف اٹھاتے رہے۔ دن نکلتے نکلتے ہماری ٹرین کزبا اسٹیشن پر رکی۔ معلوم ہوا اس اسٹیشن کے عقب میں بھارت کی سرحد ہے۔ مشکل سے سو گز کے فاصلے پر۔ دونوں

سرحدوں کے درمیان صرف خاردار تار لگے ہیں اور بس، اِدھر کی مویشی اُدھر چلی جاتی ہے اور اُدھر سے اِدھر آجاتی ہے۔ لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ اور حکومت کی احتیاط اور نگرانی کے باوجود پاکستان دشمن عناصر کو جب بھی موقع ملتا ہے ملک کی پیداوار کو ناجائز طور پر برآمد کر لیتے ہیں۔

کرنا کے بعد کئی اور اسٹیشن آئے اور مناظر حسین سے حسین تر ہوتے گئے۔ جیسے جیسے چٹاگانگ قریب آرہا تھا۔ تہہ در تہہ پہاڑوں کے سلسلے نظر آنے لگے تھے۔ ریل کے دونوں طرف کھیتوں کے ساتھ ساتھ اناس چھالیہ۔ کیلے اور کٹھل کے درخت حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے تھے۔ پہاڑی سلسلوں کے دامن کے سبزہ زار میں گھانس پھونس اور ٹین کی چھتوں کے مکانات اور پہاڑی ٹیلوں پر پختہ عمارات۔ چھوٹی بڑی ندیاں اور تالاب اور گزرگاہ کے لئے بانس کے پل۔ گھنے جنگل اس تمام سفر میں چٹاگانگ تک ہمارے شریکِ سفر رہے۔ ٹھیک ۴ ½ بجے ہم چاٹگام[1] پہنچ گئے۔

---

[1] چٹاگانگ کو یہاں چاٹگام اور چٹ گاؤں بھی کہتے ہیں۔

چٹاگانگ

سینچر تا پیر ـــــــ ۲۴ تا ۲۶ جون

ریلوے اسٹیشن پر کافی بھیڑ تھی۔ چٹاگانگ کے ڈی، پی آر او اسٹیشن پر موجود تھے اور ٹیکسیاں تیار تھیں۔ سامان لیکر ۵ منٹ میں ریسٹ ہاؤس پہنچ گئے، ریسٹ ہاؤس اسٹیشن سے نزدیک تھا اور اسٹیشن روڈ پر ہی واقع تھا ہمارے قیام کے لئے چونکہ کمرے محفوظ تھے اسلئے کوئی دقت نہ ہوئی۔ مولانا خیری۔ قیوم ملک اور شریف المجاہد اپنے احباب سے ملنے چلے گئے ذاکر صاحب اور میں نہا دھو کر بازار کی سیر کو نکلے، اسٹیشن روڈ پر ہر قسم کی دوکانیں تھیں۔ کتابوں کی بھی، کپڑے کی بھی، پھلوں

اور فرنیچر کی بھی۔ پھلوں کی ایک دوکان پر کٹھل اور انناس دیکھ کر ذاکر صاحب رک گئے اور بھاؤ پوچھا۔ پھل والے نے ایک روپیہ کٹھل کا اور تین روپے انناس کے بتائے۔ ذاکر صاحب نے سادگی سے پوچھا۔ تین روپے کے چار انناس!

دوکاندار نے کہا۔ نہیں صاحب تین روپے کا ایک۔

ذاکر صاحب حیران رہ گئے۔ دوکاندار سے کہنے لگے۔ بھائی ہم نے مہنگے سے مہنگا انناس سات آنے کا خریدا ہے۔ یہ تو بہت مہنگا ہے۔

پھل والے نے معصومیت سے جواب دیا۔ صاحب یہ چاٹگام ہے۔ سستا انناس صرف سلہٹ میں ملتا ہے۔

میں اس سوال وجواب کے دوران ــــ شہر شہر کے فرق اور مشرقی پاکستان میں پھلوں کی قلت وکثرت کا تجزیہ کرتا رہا۔ بالآخر ذاکر صاحب نے آم خرید لئے۔ آم لے کر ہم نے کچھ دیر بازاروں کے چکر لگائے۔ اُجالا بک ڈپو اور ریڈرس چیمبرس کی دوکانوں پر گئے وہاں سے ریسٹ ہاؤس لوٹ آئے۔

ریسٹ ہاؤس کے سامنے ہی چاٹگام کا مشہور مسکا ہوٹل ہے جب ہم ریسٹ ہاؤس پہنچے۔ مولانا جبری، شریف المجاہد اور قیوم ملک

واپس آچکے تھے افضل صاحب ہمیں مسکا ہوٹل میں کھانے کے لئے لے گئے۔ کھانا بہت اچھا تھا۔ چنانچہ اس اعلیٰ انتظام کے لئے افضل صاحب کو آج مولانا نے آٹھ نمبر دیکر دریا دلی کا ثبوت دیا۔ ۱۰ بجے کے قریب ہم رسیٹ ہاؤس لوٹ آئے۔

کراچی کے بعد چاٹگام ہی پاکستان کا سب سے بڑا بندرگاہ ہے اور قیام پاکستان کے بعد اس شہر کی آبادی چار لاکھ سے زائد ہو چکی ہے۔ تاریخ کے ورق الٹئے تو پتہ چلتا ہے کہ اس شہر کا آغاز قدیم ریاست تریپورہ کے مچھیروں کے ایک گاؤں کی حیثیت سے ہوا تھا۔ ساتویں صدی عیسوی میں مشہور سیاح ہولسانگ یہاں سے گذرا تھا اور اس نے اس حسین بستی کو دیکھ کر بے اختیار کہا تھا۔ "پانی کی خیالی سیج پر حسن خوابیدہ"۔ پھر آٹھویں صدی میں یہاں مسلم حکمرانوں نے اقتدار حاصل کیا لیکن دسویں صدی میں اراکان کے بودھ حکمراں نے حملہ کر کے اقتدار حاصل کر لیا اور یہاں ایک بہت بڑا مینار تعمیر کرایا جس کا نام اس نے "ست سے گانگ" (جنگ نہیں کرنی چاہئے) رکھا۔ یہی "ست سے گانگ" کثرت استعمال سے چٹا گانگ یا چاٹگام بن گیا۔ ۱۲۰۲ء سے لے کر ۱۳۳۹ء تک دلی کے ستائیس گورنروں نے یہاں حکمرانی

کی۔ اور ۱۳۳۹ء سے ۱۵۷۳ء تک بیتیس مسلم سلاطین بنگال کے خود مختار فرمانروا رہے۔ لیکن سولھویں صدی میں پھر اراکان کے حکمرانوں نے پرتگالی قزاقوں کی مدد سے اپنے بحری بیڑے کو آراستہ کیا اور مسلم حکمرانوں پر فتح پالی۔

بالآخر شائستہ خاں نے ۱۶۶۵ء میں اُنھیں شکست فاش دیکر ہمیشہ کے لئے ان کی طاقت کو ختم کر دیا اور تقریباً ایک صدی تک یہاں مسلمانوں کی حکومت رہی۔ شائستہ خاں کے بیٹے اسلام خاں نے چاٹگام کا نام اسلام آباد بھی رکھا تھا۔ اسی نام سے اب پاکستان کا نیا دارالسلطنت زیر تعمیر ہے۔ پھر ۱۷۶۶ء میں چاٹگام پر برطانیہ نے اقتدار حاصل کر لیا اور اس اقتدار کا سورج بالآخر ۱۹۴۷ء میں ڈوب گیا۔

چاٹگام کو بارہ اولیاء کا شہر بھی کہتے ہیں۔ شہر سے کوئی چھ سات میل دور نصیر آباد کے ٹیلے پر سلطان بایزید بسطامیؒ کا مقبرہ ہے جس کی زیارت کے لئے دور دور سے عقیدت مند آتے ہیں، دوسرے بزرگان دین کے مزارات بھی مرجع خلائق ہیں۔ یہاں کی تاریخی مسجدیں خصوصیت کے ساتھ جامع مسجد جو بلند پہاڑی پر بنی ہے نواب شائستہ خاں کی یادگار ہے۔ یہاں عدالت کی وسیع اور پرشکوہ عمارت بھی ایک پہاڑی پر واقع ہے اور شہر کے ہر علاقے سے نظر

آتی ہے۔ شہر کی سڑکیں بلند و پست ہیں اور نہ زیادہ چوڑی نہیں۔ ٹین کی چھتوں کے مکانات کی کثرت ہے کیونکہ یہاں بہت زیادہ بارش ہوتی ہے آزادی کے بعد چاٹگام ایک مصروف ترین بندرگاہ بن گیا ہے۔ یہاں جہازوں کی ہر وقت آمد و رفت رہتی ہے ایک اندازہ کے مطابق اس بندرگاہ سے سالانہ ۳۰ لاکھ ٹن سے زائد سامان کی بار برداری ہوتی ہے۔ بندرگاہ کی وسعت اور نقل و حمل کی مزید سہولتوں کے لئے حکومت سرگرم کار ہے۔

"مشہور سیاح ابن بطوطہ نے اس شہر کو دیکھ کر مدینۃ الاخضر (سبز شہر) کا نام دیا تھا اور قائد اعظم علیہ الرحمۃ نے اسے "مشرق کی رانی" کہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ شہر ان دونوں خصوصیات کا حامل ہے۔ کراچی کی طرح یہ شہر بھی مشترکہ تہذیب کی آماجگاہ بنتا جارہا ہے۔ چاٹگام میں بنگالی، اردو، انگریزی عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یہاں کی بنگلہ اور ڈھاکہ کی بنگلہ میں نمایاں فرق ہے۔ چاٹگام کی بنگلہ میں عربی الفاظ کی کثرت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا سبب وہ عرب جہاز راں ہیں جو یہاں بسلسلہ تجارت آتے جاتے رہے ہیں۔

ریسٹ ہاؤس پہنچکر سونے کی تیاری کر رہے تھے کہ تھوڑی ہی دیر میں بادل گھر آگئے اور بارش ہونے لگی۔ چاٹگام میں کثرت سے بارش ہوتی ہے بارش کے سبب موسم نہایت خوشگوار

ہو گیا تھا۔ جلد ہی نیند آگئی۔ صبح جب ہم بیدار ہوئے بارش ہو رہی تھی۔ لیکن سڑکوں پر کہیں بھی بارش کا پانی جمع نہیں تھا ناشتہ کے فوراً بعد پانی میں بھیگتے ہوئے ۸ بجے صدر گھاٹ پہنچے۔ صدر گھاٹ یہاں کا سب سے بڑا اور مشہور گھاٹ ہے جو دریائے کرنافلی پر واقع ہے۔ اسٹیمر دریا کے وسط میں کھڑا تھا۔ ہم لوگ چھوٹی کشتیوں میں سوار ہو کر اسٹیمر پر پہنچے۔ اسٹیمر کی دوسری منزل پر ہماری نشستیں مخصوص تھیں۔ اب دریائے کرنافلی تھا اور اسٹیمر کا ایک اور سفر۔ ہماری منزل چندر گھونا تھی جہاں کرنافلی پیپر مل ہے وہاں سے کپتائی جانا تھا ٹھیک ۸ ½ بجے اسٹیمر روانہ ہوا۔ اسٹیمر کے علاوہ دریا کے چوڑے سینے پر ان گنت چھوٹی بڑی کشتیاں اور اسٹیمروں کی آمد و رفت جاری تھی۔ کرنافلی چاٹگام ہی نہیں مشرقی پاکستان کا مشہور

لے کرنافلی (بمعنی کرن پھول) اور سنکھا (بمعنی سنکھ) ضلع چاٹگام کے دو بڑے دریا ہیں کرنافلی پہاڑی علاقے کے شمال مشرق سے جنوب اور جنوب مغرب کی سمت ۱۲۱ میل کی مسافت طے کرنے کے بعد خلیج بنگال سے جا ملتا ہے۔ چاٹگام کا شہر اور بندرگاہ اس کے دہانے سے تقریباً ۱۲ میل دور ہے۔ سنکھا اراکان اور

ترین اور اہم دریا ہے، پہاڑی علاقے میں اس کے دونوں طرف

چاٹگام کی پہاڑی سلسلے کو منقطع کرنے والی ایک پہاڑی کے شمال مشرق سے نکلتا ہے اور مشہور گاؤں "باندرابن" تک جا پہنچتا ہے۔ اسکے بعد مغرب کی سمت ۱۴۸ میل کا فاصلہ طے کر کے دریائے کرنافلی سے دس میل دور جنوب میں خلیج بنگال میں جا گرتا ہے۔ کرنافلی اور سنگھاتی سے کئی مشہور ندیاں نکلتی ہیں۔ ان دو بڑے دریاؤں اور ندیوں نے نہ صرف پہاڑی علاقوں اور نشیب میں بسنے والوں کے لئے روزی اور روٹی کے بے شمار وسیلے مہیا کئے ہیں۔ بلکہ اس تمام ضلعے کی ترقی اور خوشحالی میں ان کا حصہ ہے۔ کرنافلی اور سنگھا سال کے بارہ مہینوں میں آمدورفت اور پیداوار کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لانے لے جانے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ کرنافلی میں دور دور تک سمندروں میں چلنے والے بڑے جہاز اور اسٹیمر آ جا سکتے ہیں، لیکن سنگھا میں صرف بڑی مال بردار کشتیاں ۳۰ میل تک جا سکتی ہیں۔ کرنافلی اور سنگھا کے ذریعہ پہاڑی اور میدانی علاقوں کی پیداوار مثلاً بانس، قیمتی لکڑی، روئی، سکھائی ہوئی مچھلی، گنا، بید اور مٹی کے برتن وغیرہ کشتیوں میں لائے جاتے ہیں۔ پہاڑ کی وادیاں اور نشیبی زمینیں نہ صرف اچھی چراگاہیں بلکہ ان دریاؤں کی بدولت ان میں بہترین کاشت بھی ہوتی ہے۔

نہ صرف بانس کے گھنے جنگل ہیں، بلکہ ناریل، چھالیہ اور کھجور وغیرہ کے درختوں کا بھی ایک وسیع سلسلہ ہے۔ اسی دریا میں ہم نے عرب جہازرانوں کے طرز کی کشتیاں بھی پہلی بار دیکھیں۔ ان کشتیوں کو شمپان کہتے ہیں پتہ چلا ہے کہ شمپان کے چلانے والے ملاح بڑے جیالے اور اپنے فن کے ماہر ہوتے ہیں اور ان جہاز نما کشتیوں کو لے کر کبھی کبھی برما تک پہنچ جاتے ہیں۔

چندر گھونا میں جہاں کرنافلی کاغذ کا کارخانہ ہے چاٹگام سے تقریباً ۲۶ میل دور ہے اور کپتائی جہاں پن بجلی کا اہم منصوبہ زیر تکمیل ہے تقریباً ۳۵ میل۔ افضل صاحب نے بتایا کہ ہمارے قیام و طعام کا انتظام کپتائی میں ہے۔ لیکن جب ہم لوگ ۱۲½ بجے کے قریب چندر گونا پہنچے تو وہاں ہمیں رہبری کے لئے کوئی نہ ملا۔ افضل صاحب نے پہلے کی طرح اس موقع پر بھی بڑی مستعدی سے کام لیا لپک کر تھانہ گھاٹ پر پہنچے اور کرنافلی کاغذ مل کے ایڈمنسٹریٹو آفیسر کرنل سکندر خاں کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم نے دیکھا کہ وہ افضل صاحب کے ہمراہ گھاٹ پر تشریف لے آئے اور ہمیں کپتائی کے بجائے وہیں اتار لیا۔ گھاٹ پر خاصی بھیڑ تھی۔ کمر کمر پانی میں نوعمر لڑکے لکڑی کے ڈبلوں میں

لبکٹ، مٹھائی کی گولیاں اور مرمرے آواز لگا کر بیچ رہے تھے
بعض لڑکے تختوں کی کشتی بنا کر تیر بھی رہے تھے۔ ہم لوگ
اسٹیمر سے اتر کر گھاٹ پر آ گئے۔ کرنل صاحب نہایت محبّت
سے ملے اور فرمایا کہ ابھی سب انتظام ہو جائے گا۔ آپ حضرات
میرے ساتھ آئیں۔

تھوڑی دیر میں ایک اسٹیشن ویگن آ گئی اور ہم سامان لے کر
ڈائرکٹرس بنگلہ پہنچے۔ یہ بنگلہ ایک اونچی پہاڑی پر واقع ہے
اور راستہ کافی پُر پیچ پہاڑی پر چڑھتے ہوئے ہمیں دور دور
تک شاداب پہاڑی سلسلے نظر آئے۔ راستے کے دونوں طرف
گھنی جھاڑیوں، خودرو پودوں اور رنگا رنگ پھولوں کا نہایت
دلفریب نظارہ تھا۔ چاٹگانگ کے پہاڑی علاقوں کے حُسن اور
اُن کی دلکشی کے چرچے ہم نے ضرور سنے تھے۔ آج اپنی آنکھوں
سے اس حسین علاقہ کو دیکھ لیا۔ ہمارے پہنچنے کے فوراً بعد
کرنل صاحب بھی دوسری جیپ میں آ گئے۔ بنگلے کے کمرے کھلوائے
اور ہمارا سامان رکھوایا۔ جب ہم کمروں میں گئے تو معلوم ہوا ائیر کنڈیشنڈ
ہیں۔ منہ ہاتھ دھو کر بنگلے کے وسیع ہال میں آن بیٹھے۔ افضل
صاحب نے اس دوران کپتائی فون کیا تو کسی صاحب نے کہا۔

آجائیے کھانا تیار رہے۔ کرنل صاحب نے اسٹیشن ویگن ہمارے لئے روک رکھی تھی۔ چنانچہ ہم اسی میں کیتبائی کے لئے روانہ ہوگئے۔ چلتے وقت کرنل صاحب نے کہا کہ ۵ بجے تک کیتبائی سے واپس آجائیں تاکہ کرنافلی پیپر مل دیکھ لیں۔

اس وقت ڈیڑھ بج رہا تھا اور اب ہم اسٹیشن ویگن میں بلند پہاڑی کے پیچ در پیچ راستوں سے نیچے اتر رہے تھے۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی اور دھوپ میں پہاڑیوں کا سبزہ یوں لگ رہا تھا جیسے قدرت نے سبز مخمل کا فرش بچھا دیا ہے۔ پہاڑیوں کے درمیان دریائے کرنافلی ایک بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی کی طرح بہہ رہا تھا۔ بلندی سے اتر کر جب میدانی علاقوں میں آئے تو مناظر کا حسن کچھ اور نکھر گیا۔ اب اونچے نیچے پہاڑ اور خوبصورت جنگل حدِ نظر تک پھیلے ہوئے تھے۔ سڑک اچھی تھی اور اسٹیشن ویگن نہایت آرام دہ۔ ۹۰ میل کا راستہ معلوم بھی نہ ہوا۔

کیتبائی

کیتبائی پہنچ کر کئی جگہ معلومات کیں لیکن صحیح رہبری نہ ہو سکی کہ کھانا کہاں ہے۔؟ ہر ایک نے یہی بتایا کہ فلاں جگہ چلے جائیے۔

دو چار مقامات کے چکر لگانے کے بعد ہم ڈپٹی کمشنر کے بنگلہ تک جا پہنچے۔ انھوں نے دروازہ کھول کر افضل صاحب کو گیسٹ ہاؤس کا پتہ بتا دیا اور اندر چلے گئے۔ ہم لوگوں سے ملنے کی انھوں نے شاید ضرورت نہ سمجھی۔ گیسٹ ہاؤس پہنچے۔ کھانا کھایا اور کچھ دیر آرام کیا۔ اس تمام عرصے میں ہم اس بات کے منتظر رہے کہ کوئی ذمہ دار شخص آئے گا اور ہمیں کپتائی جیسے اہم مقام کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کرے گا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ اس تمام دورے میں یہ پہلا مقام تھا جہاں کسی شخص نے ہماری آمد سے دلچسپی نہیں لی۔

۳ بجے کے قریب ہم واپس ہوئے اور واپسی میں ہم نے کپتائی کا وہ عظیم منصوبہ دیکھا جو کرنا فلی کثیر المقاصد منصوبہ کے نام سے منسوب ہے۔ یہ منصوبہ اہم مقاصد کا حامل ہے سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ کرنا فلی میں جو آئے دن سیلاب آتا ہے اس کا سد باب کیا جائے۔ دوسرے اس دریا پر بند باندھنے سے جو پانی محفوظ ہوگا وہ کھیتی باڑی کے کام میں لایا جائے گا۔ تیسرا اور سب سے اہم مقصد یہ ہے کہ اس بند سے بجلی پیدا کی جائے۔ یہ منصوبہ ۵۲ء میں شروع کیا گیا تھا اور جس رفتار سے

ہم نے کام ہوتے دیکھا اس سے اندازہ ہوا کہ سال چھ مہینے میں یہ منصوبہ مکمل ہو جائے گا اور تکمیل کے بعد پن بجلی سے ایک لاکھ بیس ہزار کلوواٹ بجلی پیدا ہو سکے گی جس سے ڈھاکہ میمن سنگھ سلہٹ تریپورہ نواکھالی اور چاٹگام ضلعے کے ہر گاؤں میں روشنی پہنچ جائے گی اور توقعات کے مطابق مشرقی پاکستان کے ڈیڑھ کروڑ سے زیادہ افراد اس سے فیضیاب ہوں گے۔[1]

انسانی فکر اور مشینی طاقت نے یہاں بڑے بڑے پہاڑوں کو جس طرح کاٹا ہے اور دریاؤں کا رخ پھیر کر کپتائی کا عظیم شکوہ[2]

---

[1] یہ منصوبہ ۱۹۶۱ء کے آخر میں مکمل ہو چکا ہے۔ [2] یہ امریکی حکومت اور انجنیروں کے تعاون سے تیار ہوا ہے اور اس پر نصف کروڑ سے زیادہ خرچ آیا ہے۔ ۸۰۰ فٹ کی مستحکم بنیادوں پر یہ بند سمندر سے ۱۲۷ فٹ اونچا ہے اور دریا کرنافلی پر ۲۲ سو فٹ تک پھیلا ہوا ہے۔ پانی کے بہاؤ کو روکنے اور نکالنے کے لئے ۱۶ آہنی دروازے ہیں جو خودکار مشینوں سے کھولے اور بند کئے جا سکتے ہیں۔ خشکی کے زمانے میں جمع شدہ پانی کو پمپوں کے ذریعے کھیتوں تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ ایک اندازہ کے مطابق اس پانی سے ایک ایکڑ سے زائد زمین سیراب ہو سکے گی۔ اس بند کی تعمیر سے جو افراد متاثر ہوئے ہیں انھیں نئی جگہوں پر آباد کر دیا گیا ہے۔

بند تعمیر کیا ہے اسے دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ کیپتائی کا بند دیکھ کر ہم اس نوزائیدہ شہر سے گذرے جہاں ہر طرف تعمیری کام ہو رہا تھا۔ اونچی نیچی پہاڑیوں پر ان گنت خوبصورت مکانات اور بنگلے تعمیر اور تکمیل کے مرحلے میں تھے۔ پہاڑیوں سے نیچے میدانوں میں اس منصوبے کے دفاتر پھیلے ہوئے تھے دیکھتے ہی دیکھتے کیپتائی ایک نیا اور خوبصورت شہر بنگیا ہے۔ کیپتائی بند اور شہر کی تعمیر میں ہزاروں پاکستانیوں کا خون پسینہ شامل ہے۔ جنھوں نے آرام و راحت کا تصوّر کئے بغیر اپنے ملک اور قوم کی خوشحالی کے لئے شبانہ روز محنت سے کام کیا۔ اس نئے شہر میں اسکول، اسپتال، کھیل کے میدان، وسیع شاہراہیں، بازار اور دور دور تک آبادی اس بات کی غماز تھی کہ یہاں کے رہنے والوں کو تمام سہولتیں مہیا کی گئی ہیں آبادی سے گذرتے ہوئے ایک پہاڑ پر ہمیں خوبصورت بنگلوں کے سامنے کئی امریکی عورتیں اور بچے بھی نظر آئے ــ پتہ چلا کہ سو سے زیادہ انجنیئر اور ان کے افراد خاندان اس منصوبے کی تکمیل کے سلسلے میں یہاں آباد ہیں اور کام ہونے کے بعد واپس چلے جائیں گے اور تعمیر شدہ بنگلے مشینری اور دیگر عمارات حکومت پاکستان کے حوالے کر دیں گے۔

چکما قبیلہ

کپتائی اور چندرگونا کے راستے میں ایک مقام آیا جہاں سے رانگامائی کو راستہ جاتا تھا۔ راستے کے دوسری طرف دریا کے کرنا فلی تھا۔ رانگامائی چکما (جسے چاکما بھی کہتے ہیں) قبیلہ کا صدر مقام ہے۔ یہیں سے چاٹگام کے وہ پہاڑی سلسلے شروع ہوتے ہیں جن کا رقبہ پانچ ہزار مربع میل ہے جہاں گھنے جنگلوں میں ہاتھی شیر، چیتے جیسے خوفناک جانوروں کے درمیان بارہ قبیلے آباد ہیں جن میں چکما، مورنگ، موگ، ٹنکھوس اور ماگھ زیادہ مشہور ہیں ان قبیلوں میں چکما اور ماگھ دو بڑے قبیلے ہیں۔ پہاڑی چاٹگام کے ۹۶۲ گاؤں میں سے ۴۰۹ میں چکما آباد ہیں۔ تمام قبیلوں میں یہ قبیلہ زیادہ مشہور نسبتاً زیادہ مہذب ہے اور اپنے سردار کا جسے یہ "راجہ" کہتے ہیں بے حد وفادار۔ موجودہ راجہ کافی روشن خیال اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ قبیلے کے بچے علم و تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ یہ قبیلہ منگول اور آریائی نسل سے تعلق رکھتا ہے اور صدیوں سے ان پہاڑوں پر آباد ہے۔ اس قبیلے کے لوگ بدھ مذہب کے پیرو ہیں۔ یہ چکما زبان بولتے ہیں جسے

بنگالی کی ایک بولی کہا جا سکتا ہے کھیتی باڑی ان کا خاص پیشہ ہے جسے "جھوم" کہتے ہیں۔ پہاڑی ڈھلانوں پر یہ لوگ دھان روئی، سبزی وغیرہ کی کاشت کرتے ہیں درانتی اور کلہاڑی کے طرز کا ایک خاص اوزار جسے "داؤ" کہا جاتا ہے فصل اور لکڑی کاٹنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ نئی اور ترقی یافتہ دنیا کی تقریباً تمام ضرورتوں سے بے نیاز ہیں، روئی پیدا کر کے قبیلے کی عورتیں کپڑا بُن لیتی ہیں مرد جنگل سے بانس کاٹ کر اپنا گھر اور فرنیچر تیار کر لیتے ہیں۔

چکما عورتیں بڑی ہنرمند ہیں۔ بننا، کاتنا، رنگنا، گھروں کو سنبھالنا۔ کھیتوں پر مردوں کا ہاتھ بٹانا ان کے محبوب مشغلے ہیں۔ جاڑوں میں یہ لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں اور گرمیوں میں جنگل کی قیمتی لکڑی اور بانس کاٹتے ہیں، سادہ لباس، سادہ زندگی اور سادہ غذا اس قبیلے کی خصوصیات ہیں، مرد ٹخنوں تک دھوتی باندھتے ہیں۔ عورتیں اسکرٹ اور بلاؤز کی طرز کا لباس پہنتی ہیں۔ اب ساڑھی کا رواج بھی عام ہو رہا ہے۔ یہ تمام کپڑے گھروں میں ہی تیار ہوتے ہیں۔ چاول ان کی خاص غذا ہے۔ جانوروں کا گوشت بھی استعمال کرتے ہیں اور تمباکو بہت

زیادہ پیتے ہیں۔ سال کے سال چیت کے موسم میں چودھویں رات کو یہ لوگ ایک بڑا جشن مناتے ہیں جسے "تھن مانا" کہتے ہیں تہوار کے موقعوں پر چاول کی شراب پی جاتی ہے۔ اچھے اچھے کھانے پکتے ہیں۔ بدھ مذہب پر عقیدہ رکھنے کے باوجود ان کی عبادت کے طریقے ہندوؤں کی پوجا پاٹ سے کافی مماثلت رکھتے ہیں۔

قبیلے میں شادی بیاہ کی عجیب وغریب رسمیں رائج ہیں اسی طرح پیدائش اور موت پر بھی یہ اپنی دیرینہ روایات پر عمل پیرا ہیں۔ شادی کے موقع پر دولھا کے بائیں جانب دلہن بیٹھتی ہے۔ رشتے داروں میں سے ایک مرد اور ایک عورت دولھا دلہن کو کمر سے باندھ دیتے ہیں۔ گرہ لگانے سے پہلے شادی میں شرکت کرنے والے حاضرین سے اجازت حاصل کی جاتی ہے گرہ کے بعد دونوں اپنے خاندان کے بزرگوں کے پاس جاتے ہیں۔ اور وہ چاول، روئی، گھاس وغیرہ ان کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں اور دعا دیتے ہیں۔ گاؤں کا پجاری شادی کی رسمیں انجام دیتا ہے۔ لڑکے کی پیدائش کے وقت دو مرتبہ بندوق چلائی جاتی ہے اور لڑکی کی پیدائش پر ایک بار۔ قدرتی موت پر

حکما عام طور پر لاش کو جلاتے ہیں لیکن وبائی امراض میں مرنے والوں کو دفن کیا جاتا ہے۔ سات دن تک مرنے والے کا سوگ رہتا ہے۔ اس دوران میں گوشت انڈے اور مچھلی کے استعمال سے پرہیز کرتے ہیں۔ لڑکے سر کے بال منڈوا دیتے ہیں اور کئی مذہبی رسمیں ادا کی جاتی ہیں تاکہ مرنے والے کی روح کو اطمینان نصیب ہو۔

قبیلے کے مرد اور عورتیں ذوق لطیف سے بھی عاری نہیں بانسری ان کی مقبول عام موسیقی ہے اور بانسری بجانے میں مرد اور عورت یکساں مہارت رکھتے ہیں۔ گویئے گاؤں گاؤں گھومتے اور رزم و بزم کے گیت گاتے پھرتے ہیں۔ عورتوں کو پھولوں سے بھی عشق ہے اور گہنے پاتوں سے بھی جو عموماً چاندی کے ہوتے ہیں۔ مرد اور عورتیں کافی صحت مند اور جفاکش ہیں۔ ہلکے کشتی، تیراکی اور رسہ کشی کے کھیلوں سے خاص دلچسپی لیتے ہیں۔

پہاڑی علاقے کے گھنے جنگلوں میں بانس اور قیمتی لکڑی کے علاوہ ہاتھی، شیر، چیتے وغیرہ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ یہ جنگل کاکس بازار تک پھیلے ہوئے ہیں۔ انھیں جنگلوں سے ہاتھی

خاص طریقوں سے پکڑے جاتے ہیں جسے "کھیدا" کہتے ہیں

ہمارے آنے سے چند روز پہلے چاٹگام کے پہاڑی علاقوں میں کثرت سے بارش ہوئی تھی جس کے سبب رانگامائی تک جانے کا راستہ بند ہوگیا تھا۔ دریائی سفر سے تقریباً ۱۲ گھنٹے صرف ہوتے چونکہ ہمارے دورے کا پروگرام محدود تھا اسلئے خواہش کے باوجود ہم رانگامائی نہ جا سکے۔ راستے میں ایک خوبصورت مقام پر دریائے کرنافلی اور سرسبز پہاڑوں کے پس منظر میں سعید صاحب نے گروپ فوٹو لے کر سفر کے ان لمحوں کو یادگار بنا دیا۔ یادوں کے نقش تو کبھی کبھی دھندلا بھی جاتے ہیں لیکن تصویروں کے نقش یادوں کے چراغ کی مانند ہمیشہ جلتے رہتے ہیں۔ وقت اور زمانے کی گرفت سے آزاد۔

پہاڑی راستوں سے گذر کر ہم ایک اور دوراہے پر آئے جہاں سے کاکس بازار کو راستہ جاتا تھا اور جو بارش کے سبب ناقابل گذر تھا۔

کاکس بازار

چاٹگام کی پہاڑیوں کا سلسلہ برما کی سرحد کے ساتھ ساتھ

میلوں جنوب تک چلا گیا ہے۔ جہاں ساحل پر مشہور تفریحی مقام
کاکس بازار ہے کاکس بازار کا ساحل ۷۰ میل لمبا ہے اور یہ دنیا کا
سب سے لمبا ساحل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۸ ویں صدی میں ایک
انگریز مہم جو مسٹر کاکس نے یہاں آنے کے بعد ایک موگھ گاؤں
کے چہار طرف لکڑی کے جنگلے کھڑے کر دیئے تھے۔ دوسری
جنگ عظیم کے دوران یہ ایک اہم چھاؤنی تھا اور جاپانیوں نے اس پر
۲۶ مرتبہ بم برسائے۔ چاٹگام سے یہاں اسٹیمر کے ذریعہ بھی آسکتے ہیں
اور ہوائی جہاز سے بھی۔ رکیتائی اور چندر گونا کے درمیان ہمیں کاکس بازار
جانے والی سڑک بھی ملی جو بارش کے سبب ناقابل گذر تھی
کاکس بازار ساحل سمندر پر ایک خوبصورت شہر ہے۔ لکڑی
کے مکانات، ناریل کے درختوں کے جھرمٹ، پگوڈا، مندر
پہاڑیوں پر استوپ۔ ترقی یافتہ شہروں سے الگ تھلگ۔
ایک خاموش اور پرسکون بستی جہاں نہ شہروں کی ہماہمی ہے۔
نہ تصنع اور بناوٹ سے مملو زندگی۔ شہروں اور ہنگاموں سے
بیزار انسان اکثر راحت اور آسودگی حاصل کرنے یہاں آتے
ہیں اور رات کے سناٹے میں جب سمندر، آسمان اور ساحل
میں امتیاز مشکل ہو جاتا ہے۔ طوفانی لہروں کے مدھر راگ سُن کر

دنیا و مافیہا کے غموں کو بھول جاتے ہیں۔

اس خوابناک بستی میں آفاقی سناٹا بھی ہے اور متلاطم اور پُرشور سمندر کا قدرتی حصار بھی۔ سمندر کی بیکراں وسعتوں کو دیکھ کر انسان اکثر یوں محسوس کرتا ہے جیسے خود وہ معدوم ہو کر رہ گیا ہے۔

میں ابھی کاکس بازار کی..... پہنائیوں میں گم تھا کہ ایک خوبصورت پہاڑی کے دامن میں ہماری اسٹیشن ویگن یکلخت رک گئی۔ ذاکر صاحب کہہ رہے تھے۔

کتنی حسین جگہ ہے یہ۔ یہاں فوٹو ہو جائے

واہ وا۔ سبحان اللہ۔

یہ آواز مولانا خیری کی تھی۔

اور پھر ہم سب ایک ایک کر کے نیچے آ گئے۔ پرسکوت ماحول ہر سمت ہریالی۔ ایک طرف دریا، دوسری طرف اونچی نیچی پہاڑیاں اور پہاڑیوں پر بلند قامت درختوں کا پھیلاؤ۔ ساری فضا سحرزدہ سی لگ رہی تھی۔ سعید صاحب نے تصویری نقطۂ نظر سے ایک موزوں جگہ ہمیں کھڑا کیا اور کلک کے ساتھ پہلے کی طرح اس مقام کو بھی جاوداں بنا دیا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم چندر گونا کے ڈائرکٹرس بنگلے پہنچ گئے جہاں کرنل صاحب ہمارے منتظر تھے۔ کرنل صاحب نے چائے سے ہماری تواضع کی۔ چائے پی کر ہم ان کے ہمراہ کرنا فلی پیپر مل دیکھنے روانہ ہو گئے۔

کرنا فلی پیپر مل

مل کی وسیع و عظیم الشان عمارت میں داخل ہوتے ہوئے تو قمر الحق صاحب پروڈکشن منیجر نے ہمارا خیر مقدم کیا اور سلسلے وار مل کے مختلف شعبے دکھائے۔ کاغذ کی تیاری کے سلسلے میں جو طریق کار ہم نے کھلنا نیوز پرنٹ فیکٹری میں دیکھا تھا یہاں بھی تقریباً اسی طریق کار پر معمولی تبدیلیوں کے ساتھ عمل درآمد تھا۔ مختلف قسم کا معیاری سفید اور رنگین کاغذ اس مل میں تیار ہوتا ہے چاٹگام کی پہاڑیوں کے جنگلوں سے بانس کاٹ کر دریائے کرنا فلی اور معاون ندیوں کے ذریعہ یہاں لاتے ہیں۔ مل کے کنارے کرین لگے ہیں جو دریا سے بانس کے گٹھے اٹھا کر ایک جگہ جمع کر دیتے ہیں۔ پھر خود کار مشینیں انھیں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تبدیل کر دیتی ہیں اور یہ ٹکڑے ایک بڑے کڑھاؤ میں

ڈال کر پکائے جاتے ہیں۔ مِل میں ایسے چھ کڑھاؤ ہیں، ۶۔۷ گھنٹے پکانے کے بعد بانس کا گودا تیار ہو جاتا ہے اور باقی اور ریشے کو جسے پلپ کہتے ہیں علیحدہ کر کے بڑی چکیوں کے ذریعہ کیمیکلز کی آمیزش کے بعد سوفٹ کی مہین اور نازک جالیوں سے گذارتے ہیں۔ یہ جالی جیسے جیسے آگے بڑھتی ہے اس سے پانی رِس رِس کر گرتا رہتا ہے اور کافی دور پہنچنے کے بعد بھیگا ہوا کاغذ تیار ہو جاتا ہے۔ پھر بھیگے ہوئے کاغذ کو مشینوں کے ذریعہ اونی کمبل پر منتقل کرنے کے بعد اسے لوہے کے سلنڈروں پر مقررہ حد تک گرمی پہنچائی جاتی ہے تا آنکہ سوکھا ہوا نہایت نفیس سفید کاغذ رولوں پر لپٹ کر مشینوں سے برآمد ہونے لگتا ہے۔ پھر مختلف سائزوں میں اسے کاٹ کر وزن کرنے کے بعد پیک کیا جاتا ہے۔ اور خاص قسم کے بار برداری کے جہازوں میں لاد کر منزل مقصود پر روانہ کر دیا جاتا ہے۔

کرنا فلی پیپر مِل کی تجویز ۱۹۴۹ء میں تیار کی گئی تھی؛ ۱۹۵۲ء میں اسے پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کے سپرد کیا گیا اور اور ۱۶ اکتوبر ۵۳ء کو پہلی مرتبہ پاکستان میں کاغذ تیار ہوا

اور مل نے ۶ کروڑ روپے سالانہ کے سرمایہ سے کام شروع کر دیا یہ مل سوٹن روزانہ کاغذ تیار کر سکتا ہے۔ مل میں ساڑھے تین ہزار سے زائد افراد کام کرتے ہیں۔ ان ملازمین کے لئے نہایت آرام دہ اور کشادہ مکانات مہیا کئے گئے ہیں۔ مل کے اندر ہی اسکول، اسپتال، مسجد، بازار اور ضرورت کی تمام سہولتیں موجود ہیں۔ ملازمین کی فلاح و بہبود پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔ مل کے ارد گرد نہایت خوبصورت اونچی نیچی شاداب پہاڑیوں پر مکانات اور بنگلے ہیں۔ کھلے میدانوں میں بھی ہر طرف سبزہ، خوشنما پارک اور کھیل کے میدان ہیں۔ جہاں شام کے وقت بڑی رونق اور چہل پہل نظر آتی ہے۔

مل دیکھنے کے بعد ہم سوئس منیجر سے ملنے گئے اور اس سے مختلف سوالات کئے۔ سوئس منیجر نے کہا کہ وہ عنقریب واپس چلا جائے گا اور اس کی جگہ پاکستانی اس اہم جگہ کو سنبھالے گا۔ اس نے بتایا کہ مل میں پاکستانی ہنرمندوں کا اضافہ ہو گیا ہے۔ مل کے کارکنوں کی دیکھ بھال اور فلاح و بہبود پر کرنل سکندر خاں بطور خاص توجہ دیتے ہیں اس لئے کام کرنے والے مطمئن اور خوش ہیں۔ ہم نے کاغذ کی گراں قیمتوں پر

منیجر کو توجہ دلائی تو اس نے بعض فنّی نکتے ہمیں سمجھائے۔ لیکن اس کے باوجود اس نے یہ تسلیم کیا کہ کاغذ تیار کرنے والے مشہور ملکوں کے مقابلے میں کرنافلی کاغذ کی قیمت زیادہ ہے۔ جو آئندہ زیادہ پروڈکشن اور کھپت کی صورت میں کم ہو جائے گی۔

مل سے واپسی میں کرنل صاحب نے وہ جگہ بتائی جہاں مرحوم خورشید کو شہید کیا گیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اس مل کی بنیادوں میں مرحوم کا خون شامل ہے۔ افسوس کہ سوچی سمجھی سازش کے تحت وطن دشمن عناصر نے ہم سے خورشید جیسا ماہرِ فن چھین لیا۔

مغرب کے لگ بھگ ہم قیام گاہ پر پہنچے۔ جس وقت ہم مل کے اندر تھے وہاں بے حد گرمی تھی۔ مل دیکھ کر واپس ہوئے تو حبس تھا۔ آسمان پر سیاہ بادلوں میں بجلی کوند رہی تھی ڈائرکٹرس بنگلہ اگرچہ کافی بلند پہاڑ کی مسطح چوٹی پر واقع تھا لیکن وہاں بھی ہوا بند تھی۔ بنگلے کے اردگرد کھلا میدان تھا اور میدان کے بعد احاطہ کی دیوار بنی تھی۔ کچھ دیر ہم لوگ کھلے میدان میں گھومتے رہے احاطے کی دیوار کے ایک جانب کرنافلی کاغذ مل اور بستی نظر آرہی تھی اور تین طرف پہاڑوں کا سلسلہ تھا۔ درمیان

میں کرنافلی تنگ دائروں کی صورت میں بہہ رہی تھی۔ بے حد خوبصورت نظارا تھا۔

یکایک بارش شروع ہوگئی اور ہم لوگ بھیگتے ہوئے بنگلے کے بڑے کمرے میں آگئے اور دیر تک باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اب موسم بے حد خوشگوار ہوگیا تھا۔ ۹ بجے کھانا کھایا۔ کرنل صاحب آگئے اور آدھی رات تک مختلف موضوعات اور ملک کے مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔ کرنل صاحب ایک بااصول فوجی آدمی ہیں ان کی گفتگو بے حد دلچسپ تھی۔ انھوں نے خورشید مرحوم کی شہادت کا صحیح پس منظر بتایا اور ان کی کارکردگی اور کارگنوں کے حالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ کرنل صاحب نے کشمیر کی جنگ، خان لیاقت علی کی شہادت اور سید اکبر کے بارے میں بھی بعض ایسی باتیں ہمیں بتائیں جو اس سے پہلے نہیں سنی تھیں۔ باتوں باتوں میں مولانا نے اُن سے دریافت کیا بنگال کی آنکھ، بنگال کے بال اور بنگال کے جادو کی کیا حقیقت ہے؟ کرنل صاحب نے ہنس کر جواب دیا کہ بنگال کی آنکھ کلکتے اور اس کے اطراف میں رہ گئی، بال راجشاہی کی طرف ہیں اور جادو چٹاگانگ کی پہاڑیوں میں ہے۔ یہی سوال مولانا کئی حضرات سے دریافت

کر چکے تھے۔ ایک صاحب نے بتایا تھا کہ بنگال کا جادو دراصل بنگال کی عورت ہے، جو بے حد اطاعت شعار، خدمتگذار اور وفا پرست ہے اور اپنی ان صفات سے مردوں کا دل موہ لیتی ہے۔ لیکن میرا اپنا خیال یہ ہے جو میں مولانا پر بھی ظاہر کر چکا تھا کہ بنگال کا جادو دراصل آب رواں کی یہ حسین و شاداب سرزمین ہے جس کی مادرانہ آغوش میں جیالے، محنت کش اور بہادر، مزدور، کسان اور مانجھی بستے ہیں جو اپنے ملک، اپنے وطن اور اپنی آزادی کے تحفظ میں سب سے آگے ہیں۔ یہی وہ سرزمین ہے جس کا چپہ چپہ ادب، موسیقی، مصوری، تہذیب اور ثقافت کا امین اور وارث ہے۔ جس کی وسیع پہنائیوں میں صدیوں کی گرد سے اٹی ہوئی عمارتوں کے کنگرے اور گنبد تاریخ کی داستانیں سناتے ہیں۔ جہاں بھٹیالی کی تانیں، ٹیگور اور نذرل کے نغمے، زین العابدین کے نقش و نگار اور جسیم الدین کے گیت فضاؤں میں گونجتے ہیں۔

کرنل صاحب کے رخصت ہونے کے بعد ہم لوگ سونے کے لئے اپنے کمروں میں چلے گئے اور بہت سویرے جاگ پڑے رات بھی بارش ہوتی رہی اور اس وقت بھی ہو رہی تھی۔

پروگرام کے مطابق ہمیں صبح کے اسٹیمر سے چٹاگانگ لوٹنا تھا افضل صاحب نے رات ہی کو کرنل صاحب سے کہدیا تھا کہ کپتائی سے باتھانہ گھاٹ سے اسٹیمر پہ ہمارے لئے جگہ محفوظ کرادیں۔ ۹ بجے کرنل صاحب کا فون آیا۔ انھوں نے کہا کہ اسٹیمر پر جگہ مل جائیگی، لیکن اس کی روانگی میں دیر ہے اس لئے آئی سی اے کا ایک لانچ چٹاگانگ جارہا ہے اور انھوں نے ہمارے لئے انتظام کردیا ہے اسٹیشن ویگن آرہی ہے۔ اس میں سب حضرات آجائیں۔ ہم لگ تیار ہی تھے، گاڑی آتے ہی سامان سمیت گھاٹ پہ پہنچ گئے۔ جہاں لانچ ہمارے انتظار میں تھا۔ کپتائی بند کی تعمیر کے سلسلے میں یہ لانچ اکثر آتے جاتے تھے اسٹیمر کے مقابلے میں یہ لانچ بہت چھوٹا تھا۔ لیکن صاف ستھرا، کھلا ہوا اور نہایت تیز رفتار تھا۔ کرنل صاحب نے جس محبت سے ہمیں خوش آمدید کہا تھا۔ اسی محبت سے رخصت کیا۔ ان کی پرکشش شخصیت، اصول پسندی اور مہمان نوازی کا گہرا نقش لے کر ہم روانہ ہو گئے۔ اور دو سوا دو گھنٹے میں خوب اور خوبصورت مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ساڑھے گیارہ بجے چٹاگانگ پہنچ گئے۔ لانچ سے اتر کر گھاٹ پر آئے۔ رکشاؤں میں بیٹھے اور ریسٹ ہاؤس پہنچ گئے۔

کچھ دیر بعد ڈسٹرکٹ پبلک ریلیشن آفیسر آ گئے انھوں نے بتایا کہ سہ پہر کو مقامی اخبار نویسوں کی طرف سے عصرانہ ہے ڈھاکہ کے لئے پی آئی اے سے ہماری نشستیں محفوظ ہو چکی ہیں

وقت بہت کم تھا۔ کھانے کے فوراً بعد مولانا خیری، قیوم ملک اور میں دو چار کتب فروشوں سے ملے وہاں سے بازاروں میں خریداری کے لئے چکر لگائے اور ایک دوکان سے بید کے نہایت خوبصورت اور سستے صندوق خرید گئے۔ سلہٹ میں اور چاٹگام میں بید کا بہترین سامان تیار ہوتا ہے۔ چونکہ ان مقامات پر بانس کی افراط ہے اسلئے کراچی کے مقابلے میں بے حد سستا ہے۔

وقت نہ ہونے کے باعث خواہش کے باوجود ہم شہر چاٹگام کے تاریخی اور مشہور مقامات نہ دیکھ سکے۔ اس کے لئے ایک دن درکار تھا اور ہمیں پروگرام کے مطابق آج ہی ڈھاکہ پہنچنا تھا۔ کیونکہ وہاں متعدد تقریبات تھیں۔

رلسیٹ ہاؤس آئے تو مقامی صحافی، اخبار نویس اور خبر رساں ایجنسیوں کے نمائندے وہاں جمع تھے۔ عصرانہ کے دوران تبادلۂ خیالات ہوا۔ یہاں سے دو انگریزی کے اور دو بنگلہ کے اخبارات

نکلتے ہیں۔ محبوب العالم صاحب نے جو زمانہ اور یونیورسٹی سے وابستہ
ہیں عبدالستار صاحب کی جوانمرگی کے سلسلہ میں ایک عجیب انکشاف
کیا۔ انھوں نے بتایا عبدالستار چاٹگام گورنمنٹ کالج میں لکچرار
تھے۔ ان کی عمر ۳۰، ۳۲ سال ہوگی۔ اسی سال انھیں آدم جی
ادبی انعام ملا تھا۔ وہ اس پر بے حد خوش تھے۔ لیکن میمن سنگھ
کے ایک ماہنامے "آگامی" نے ان کی انعام یافتہ تصنیف "کوبی دا"
پر سخت تنقید ہی نہیں بلکہ تنقیص کی اور یہاں تک لکھ دیا کہ عبدالستار
ابھی نو عمر ہیں۔ اتنے کم عمر مصنف کو کیوں انعام دیا گیا۔ عبدالستار
نے جب یہ تبصرہ پڑھا تو انھیں سخت صدمہ ہوا اور یہ صدمہ
ہی اُن کی موت کا سبب بن گیا۔ اس تصنیف میں نذرالاسلام
کی زندگی ڈرامائی انداز میں پیش کی گئی ہے۔ محبوب العالم صاحب
نے کہا کہ نو عمر مصنفین کو انعامات دینے کے سلسلے میں۔ انھوں
نے گلڈ کو چند تجاویز ارسال کی ہیں تاکہ اس نوع کے حادثات
کا اعادہ نہ ہو۔

بہر حال وہ کچھ بھی ہو۔ عبدالستار جیسے نو عمر اور لائق ادیب
کی جواں مرگی پر ہم سب کو افسوس ہوا۔

دوران گفتگو علم ہوا کہ ڈھاکہ کے بعد چٹاگانگ ہی صحافت

کا بڑا مرکز ہے اور یہاں سے شائع ہونے والے اخبارات قریب ودور کے دیہاتوں کو خبریں اور معلومات پہنچانے کا فرض انجام دے رہے ہیں۔

صحافیوں سے رخصت ہو کر ۴ بجے ہم لوگ روانہ ہوئے اور پورٹ ایریا کو دیکھتے ہوئے جہاں وسیع پیمانے پر تعمیری کام ہو رہا تھا اور دور دور تک آبادی پھیلی ہوئی تھی ۴½ بجے ائیرپورٹ پہنچ گئے۔ پی۔آئی۔اے کا طیارہ پرواز کے لئے تیار تھا پونے پانچ بجے جہاز نے اُڑان کی، سمندروں، وادیوں، مرغزاروں اور سبزہ زاروں پر سینہ تانے اور بازو پھیلائے اڑتا ہوا صرف ۴۵ منٹ میں اپنی منزل ڈھاکہ پر جا اُترا۔

شام کے سکوت میں شفق کی لالی نے سمندر میں سونا پھیلا کر چاٹگام سے ڈھاکہ تک کے خطۂ شاداب کو قرمزی لباس پہنا دیا تھا۔ جہاز کے کئی مسافر مناظر کی سحر آگینی سے بے تعلق انگریزی رسالوں کے مطالعے میں غرق تھے۔

چاٹگام سے ڈھاکہ بذریعہ ریل کوئی آٹھ گھنٹے کا سفر ہے۔ لیکن ہوائی جہاز نے اس فاصلے کو ایک جست میں ختم کر دیا۔ کرایہ بھی کچھ زیادہ نہ تھا۔ صرف ۳۳ روپلے،

ڈھاکہ ایئرپورٹ سے باہر آئے۔ رستم علی سواری لئے موجود تھے ـــــ سامان لے کر ہوٹل شاہ باغ پہنچے اور قیام کیا۔

ڈھاکہ

منگل تا جمعہ —— ۲۷ تا ۳۰ جون

صوبائی دارالحکومت ہونے کی وجہ سے ڈھاکہ[1] کی اہمیت دن بدن بڑھ رہی ہے یہ قدیم اور تاریخی شہر جسے شہزادہ عظیم الشان نے جہانگیر نگر کے نام سے موسوم کیا تھا دریائے بوڑھی گنگا کے شمالی ساحل پر واقع ہے۔ جو دریائے دھالیشری کی ایک شاخ ہے۔ ضلع ڈھاکہ کی معاشی زندگی میں ان دونوں دریاؤں کا بڑا حصہ ہے۔ دریائے دھالیشری میمن سنگھ کے

---

[1] کہاجاتا ہے کہ "ڈھاکیشری مندر" کی مناسبت سے یہ شہر ڈھاکہ کہلانے لگا۔

سب ڈویژن تنگائیل کے جنوب مغرب میں ناگرپور تھانے کے پاس الاسین بندرگاہ کے نزدیک جمنا کی ایک مشرقی شاخ سے نکلتا ہے اور پھر ٹیڑھے ترچھے راستوں سے گذرتا ہوا سیتالکھا جا پہنچتا ہے۔ وہاں سے منشی گنج کے قریب دریائے میگھنا سے مل جاتا ہے۔ دھالیشری کی کل لمبائی تقریباً سو میل ہے ڈھاکہ سے کچھ دور ایک مشہور مقام شابھار ہے جہاں بڑی بڑی جھینگڑی مچھلیاں پائی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں کبیرراج بھی رہتے ہیں جن سے علاج کرانے کے لئے دور دراز مقامات سے لوگ آتے ہیں۔ شابھار کے جنوب میں ایک مقام سے دریائے بوڑھی گنگا نکلتی ہے اور شمال میں باکلاتلی کے پاس پھر دھالیشری سے مل جاتی ہے بوڑھی گنگا کی لمبائی بمشکل ۲۶ میل ہے۔ دھالیشری اور بوڑھی گنگا ڈھاکہ اور ضلع ڈھاکہ کی تجارت اور آمدورفت کا بڑا ذریعہ ہے۔ کسی زمانے میں یہ دونوں دریا بڑے تندو تیز تھے لیکن اب ان دریاؤں کی تہہ میں ریت اور مٹی جم گئی ہے جس کے باعث ان کی رفتار مدھم ہو کر رہ گئی ہے۔ لیکن پھر بھی ان کی اہمیت سے انکار نہیں۔ ان دریاؤں کے کنارے



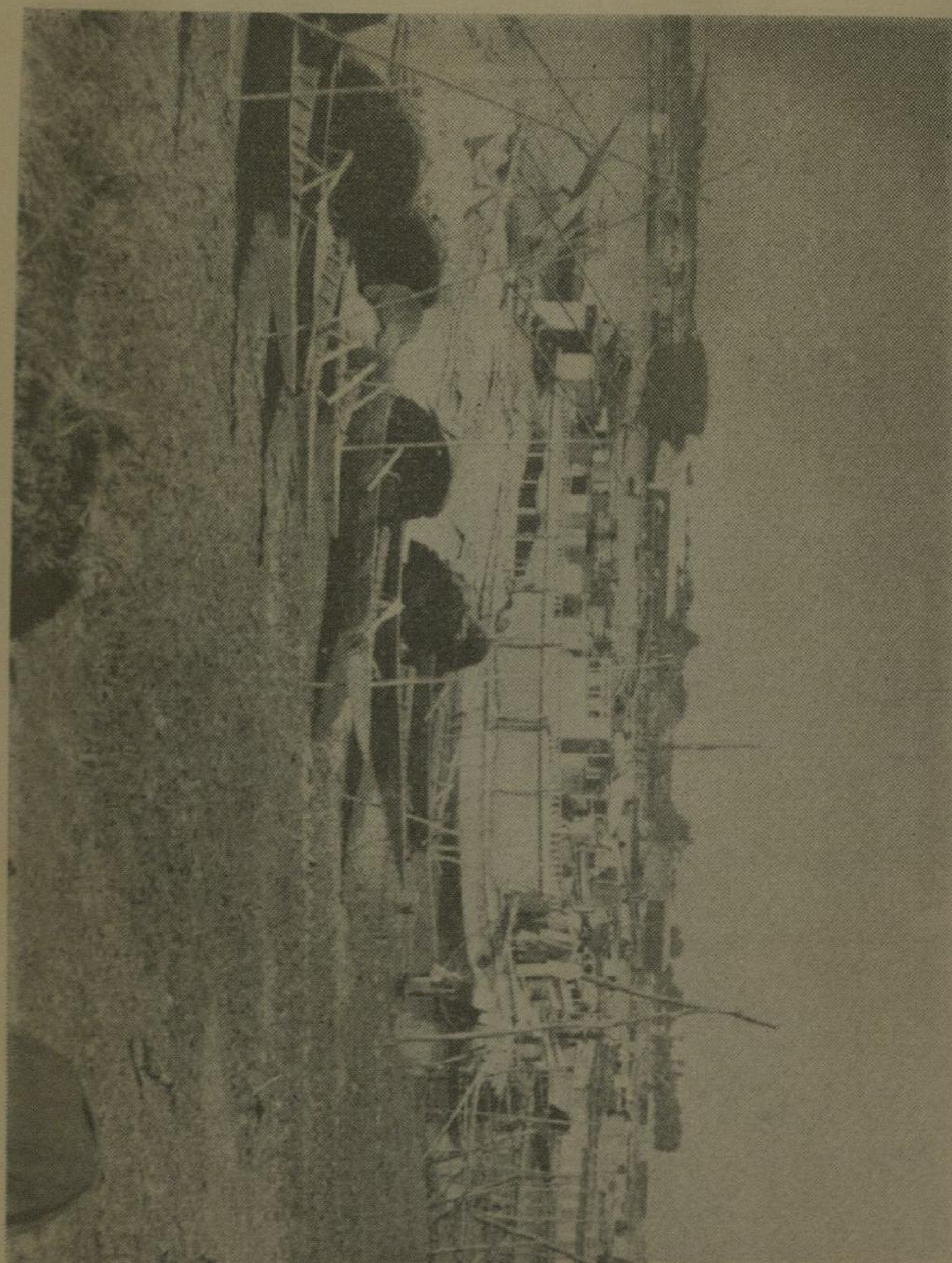
ارتقا کے پیشوا تہذیب کے پروردگار



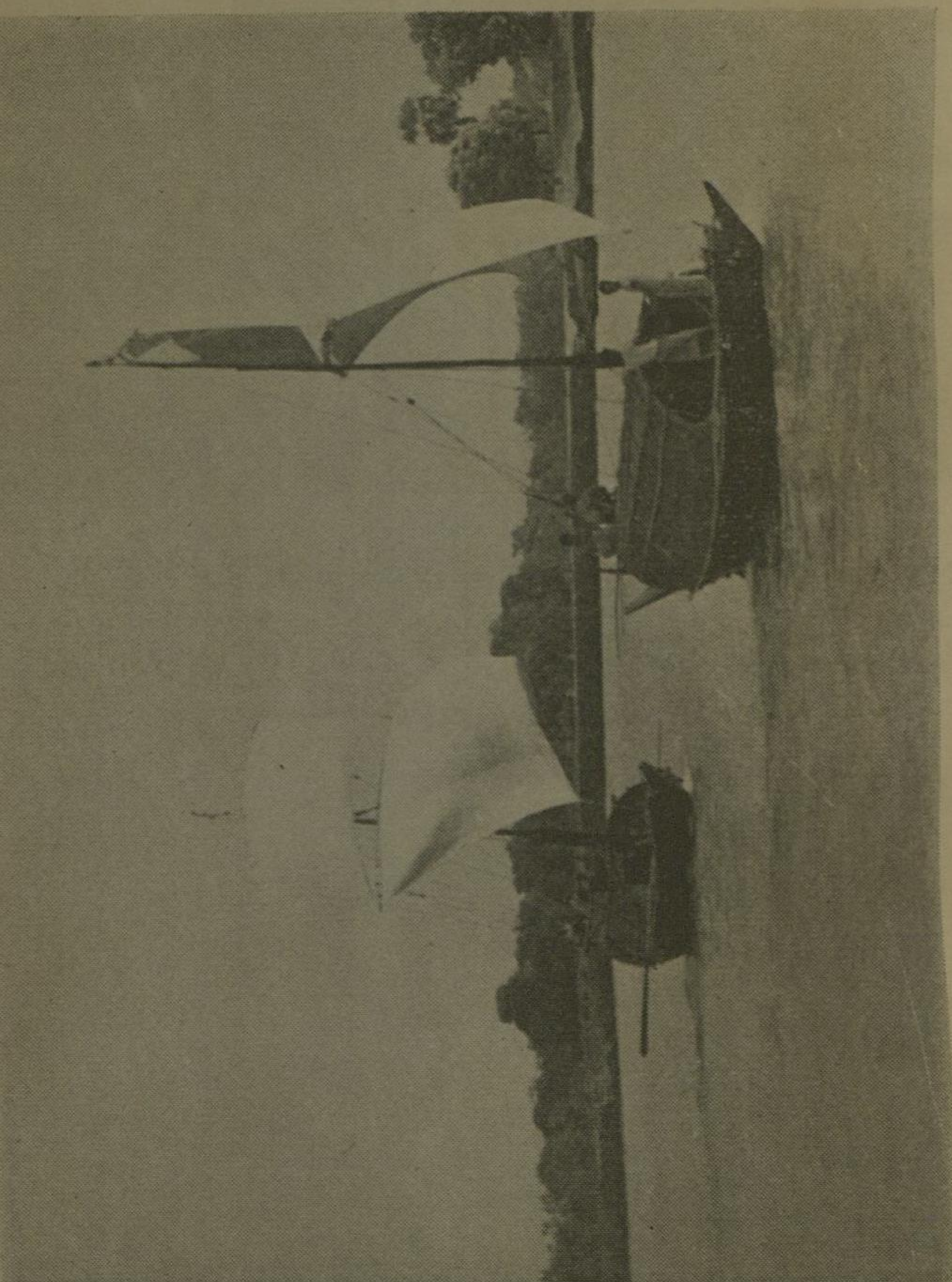
شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجوم نخیل
(باریسال کا ایک منظر)



وہ یکایک ابر گھر آنے سے منظر کا سنگھار
(کھلنا کا ایک منظر)



روحِ عشرت گہ ساحل جانِ طوفان عظیم



میگھنہ تانے کشتیاں دریا بہ دریا ہم بہ ہم



چندر گونا کے ڈائرکٹرس بنگلہ میں - عقب میں دریائے کرنافلی اور چاٹگام کی
پہاڑیاں نظر آرہی ہیں جہاں کئی قبیلے آباد ہیں (دائیں سے بائیں
قیوم ملک ، مولانا رازق الخیری ، شریف المجاہد ، افضل حسین ، ذاکر علی
صہبا لکھنوی اور مل کا ڈرائیور





بنگلہ اکیڈیمی میں مولانا خیری شکریہ ادا کر رہے ہیں۔
بائیں جانب ڈاکٹر شہید اللہ تشریف فرما ہیں۔



ہوٹل شاہ باغ میں الوداعی عشائیہ کا ایک منظر
(سید ہاشم رضا اور صہبا لکھنوی)

جو تجارتی مرکز قائم ہیں ان کے ذریعہ مقامی پیداوار دھان، پٹ سن، مونگ پھلی، تل، سرسوں، گگڑی، تربوز، گنا وغیرہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا ہے۔

مشرقی پاکستان میں شاید ہی کوئی ایسا دریا ہو جس کی اپنی جداگانہ حیثیت برقرار ہو۔ ہر دریا دوسرے دریا سے کسی نہ کسی مقام پر مل جاتا ہے۔ برسات میں سیلاب اور طوفان آئے دن کی بات ہے۔ جاڑوں میں دریا سکڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ جب سیلاب کا زور بڑھتا ہے تو ان گنت پرانی بستیاں، تیار فصلیں اور کنارے کے علاقے ڈوب جاتے ہیں اور جب ان دریاؤں میں ٹھہراؤ پیدا ہو جاتا ہے تو نئے جزیرے وجود میں آ جاتے ہیں جہاں نئی بستیاں آباد ہو جاتی ہیں پھر یہ دریا اکثر اپنے راستے بھی بدل دیتے ہیں۔ دریائے پدما اور برہمپترا اس سلسلے میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مشرقی پاکستان کے لئے یہ تغیر و انقلاب ایک مستقل مسئلہ ہے جس پر قابو پانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ہمارا دورہ عملاً ختم ہو چکا تھا اور اب ۳۰ جون تک ہمیں ڈھاکہ میں ہی رہنا تھا۔ کیونکہ یہاں متعدد تقریبات تھیں۔ ۲۶ کی تمام

کو ڈھاکہ پہنچنے کے فوراً بعد احباب کی آمد شروع ہو گئی۔ چند دوستوں کو ہم نے فون پر اطلاع دی۔ مغرب کے بعد صلاح الدین محمد اور ادیب سہیل ملاقات کے لئے آ گئے۔ ادیب سہیل ازرہِ محبت ۳۰۰ میل کا فاصلہ طے کر کے سید پور سے ڈھاکہ آئے تھے نہایت تپاک سے ملے ان کے ساتھ سید پور کے دو ادیب بھی تھے۔ پھر سردربارہ بنکوی، وحید قیصر ندوی اور اختر پیامی آ گئے۔ دو ڈھائی گھنٹے مختلف مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔

۲۷ کی صبح رستم علی اور افضل حسین ہمیں فروٹ ڈیولپمنٹ بورڈ کے جلسے میں لے گئے۔ صوبے کے گورنر اعظم خاں صاحب نے جلسے کی صدارت کی اور نہایت پر مغز تقریر فرمائی۔ انھوں نے بورڈ کو نہایت قیمتی مشورے دیئے۔ اعظم خاں صاحب کو ہم نے پہلی بار قریب سے دیکھا تھا اُن کی شخصیت نے ہمیں کافی متاثر کیا۔ جلسے کے اختتام پر ہمارا تعارف کرایا گیا۔ تعارف کے دوران ہی چیف سکریٹری سید ہاشم رضا صاحب بھی آ گئے اور فرداً فرداً ملاقات کی۔ وہاں سے ہم لوگ موتی شاہ باغ واپس ہوئے۔ کچھ دیر بعد ادیب سہیل اور صلاح الدین محمد آ گئے میں اُن دونوں کو لے کر ڈھاکہ کی مشہور ساڑھیاں خریدنے

نیو مارکیٹ گیا ایک سے ایک اچھی ساڑھی دیکھی۔ ڈھاکہ کے علاوہ راجشاہی کی تیار کردہ ساڑھیاں بھی دیکھیں اور چند ایک خرید لیں۔ صنعت پارچہ کی تیز رفتار ترقی کے باوجود ڈھاکہ کی ململ اور ساڑیوں کی شہرت دور دور ہے۔ لاکھوں خاندان دستکاری کی اس صنعت پر زندہ ہیں۔ خوبصورتی اور معیار کے باوجود ان کی قیمتیں کم ہیں۔ ہم لوگ بازار سے لوٹ ہی رہے تھے کہ ایک طرف سے حنیف فوق آتے ہوئے نظر آئے۔ لپک کر گلے ملے۔ پھر گلے شکوے ہوئے۔ وہ ہمارے ساتھ ہی ہوٹل آ گئے اور ۵ بجے تک رہے۔

پروگرام کے مطابق ۵ ½ بجے ریڈیو اسٹیشن پہنچے۔ ڈاکٹر شمس الہدیٰ چودھری صاحب نے ہمارا خیر مقدم کیا اور ہم سے دورہ کے متعلق انٹرویو کی خواہش کی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ ہم میں سے ہر ایک نے مختلف مسائل پر سوالات کے جوابات تیار کئے۔ لیکن ریکارڈنگ نہ ہو سکی کیونکہ اعظم خاں صاحب اپنی صبح کی تقریر کا ریکارڈ سننے آ رہے تھے اور ریڈیو کے کارکنان اس سلسلے میں کافی مصروف تھے۔ گورنر صاحب آئے تو یہاں بھی اُن سے سرسری ملاقات ہو گئی۔ اور دوسرے روز صبح

۸ بجے اُن سے ملاقات کے لئے وقت مقرر ہو گیا۔

ڈھاکہ ریڈیو اسٹیشن سے سیدھے پریس کلب پہنچے جہاں بدرالدین صاحب ایڈیٹر مارننگ نیوز نے ہمارے اعزاز میں عشائیہ ترتیب دیا تھا۔ عشائیہ میں ادیبوں، صحافیوں، عمائدین شہر اور سرکاری افسروں نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ بدرالدین صاحب نے خیر مقدمی تقریر میں نہایت خلوص سے ہمارا تذکرہ کیا اور مشرقی و مغربی پاکستان میں قریبی ربط و تعلق پیدا کرنے اور ایک دوسرے کے مسائل کو سمجھنے کے لئے ادیبوں اور صحافیوں کے آزادانہ تبادلے کی اہمیت پر زور دیا۔ ہماری نمائندگی مولانا رازق الخیری نے فرمائی اور پرخلوص خیر مقدم، مہمان نوازی اور محبت کا شکریہ ادا کیا۔

۲۸ کی صبح ۸ بجے سید احمد صاحب ڈائرکٹر تعلقات عامہ کی معیت میں گورنر ہاؤس پہنچے۔ کچھ دیر کمرۂ انتظار میں ٹھہرے۔ پتہ چلا علماء کے وفد سے گورنر صاحب تبادلۂ خیال فرما رہے ہیں۔ دس پندرہ منٹ کے بعد ہمیں یاد کیا گیا۔ گورنر صاحب نے نہایت گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور پھر گفتگو کا سلسلہ چل پڑا۔ ۱۵ منٹ کا انٹرویو ۴۵ منٹ تک جاری رہا۔ گورنر صاحب نے

ہی گفتگو شروع کر دی اور مشرقی پاکستان کے عام مسائل سے لے کر اسلام کے اثرات اور علماء کی خدمات تک ہر گوشے پر تفصیل سے اظہار خیال کیا۔ انھوں نے کہا مادیت کے اس دور میں انسانی قدریں ختم ہو رہی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلام کی اعلیٰ قدروں کو عام کیا جائے۔ مشرقی پاکستان کے عوام عام طور پر مذہبی رجحانات رکھتے ہیں یہ ہمارے علماء کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اسلامی اثرات کے باعث عوام مصائب اور مشکلات کے دنوں میں بھی حوصلہ نہیں ہارتے اور خدا پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اس صوبے کے ان گنت مسائل ہیں جنھیں عوام کے تعاون سے حل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ نئی بستیوں، ذرائع آمد و رفت، تجارتی اور معاشی وسائل کو مستحکم کرنے کے لئے نئے پلوں کی تعمیر اور طوفانوں اور سیلابوں کی روک تھام کے لئے کام ہو رہا ہے لیکن ابھی تعلیمی سہولتوں کو عام کرنے۔ غربت اور افلاس کے خاتمے، بڑھتی ہوئی آبادی کی روک تھام اور صنعتوں کی ترقی کے لئے اجتماعی مساعی کی سخت ضرورت ہے کیونکہ ہمارا ملک نیا ہے اور ہمارے وسائل محدود ہیں۔

گورنر صاحب کی فکر انگیز گفتگو نے سبھی کو متاثر کیا، ڈاب پی کر ہم لوگ رخصت ہوئے اور ریڈیو اسٹیشن پہنچے، ریکارڈنگ کا پہلے سے انتظام تھا چنانچہ ہر ایک نے دو دو تین تین سوالات کے جوابات ریکارڈ کرائے۔ ریکارڈنگ کے بعد ذاکر علی دفتر پاسبان اور شریف المجاہد کسی دوست سے ملنے چلے گئے مولانا، قیوم ملک اور میں صدیقی صاحب کے دفتر پہنچے وہاں سے پاک کتاب گھر کے نجم الحسن صاحب سے ملنے گئے۔ انھوں نے نہایت لذیذ گلاب جامنوں سے تواضع کی اور نہایت اچھے سانچی پان کھلائے ان سے مل کر مارننگ نیوز کے دفتر پہنچے۔ مولانا خیری بدرالدین صاحب سے گفتگو کرتے رہے اور میں اختر پیامی۔ صلاح الدین ادیب سہیل اور دوسرے احباب سے باتیں کرتا رہا۔ صلاح الدین محمد نے کہا کہ انجمن ادب والے جلسہ کر کے بلانا چاہتے ہیں۔ میں نے پروگرام ان کے سامنے رکھ دیا اور کہا کہ کوشش کے باوجود تمہارے گھر تک نہیں جا سکا تاکہ ام عمارہ سے مل لیتا۔ انھوں نے کہا کہ وہ کل دوپہر میں ملنے آئیں گی۔ میں نے بتایا کہ یہاں کے تمام ادیبوں سے فرداً فرداً ملنا ناممکن ہے۔ کیونکہ تقریبات کے پروگرام پہلے سے بن چکے ہیں۔ چنانچہ میں نے اور مولانا نے

موسیٰ احمد صاحب سے بطور خاص درخواست کی ہے کہ استقبالیہ دعوتوں میں یہاں کے تمام ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کو مدعو کیا جائے تاکہ ہمیں ملاقات اور تبادلۂ خیال کا موقع مل سکے۔

۲ بجے کے قریب ہم ہوٹل پہنچے۔ کھانے سے فراغت پائی تھی کہ وحید قیصر ندوی۔ افسر ماہ پوری اور عابد دانا پوری آ گئے مولانا ندوی نے کھلنا اور چاٹگام ہمارے ساتھ جانے کا پروگرام بنایا تھا لیکن مصروفیت کے سبب نہ جا سکے تھے۔ اب وہ اس کی معذرت کرنے آئے تھے۔ افسر ماہ پوری اور عابد دانا پوری سے کوشش کے باوجود ہم اب تک نہ مل سکے تھے۔ ان دونوں احباب سے مل کر بے حد مسرت ہوئی۔ دیر تک ڈھاکہ اور کراچی کے ادیبوں اور ادبی مسائل پر تفصیل سے گفتگو ہوتی رہی۔

۵ بجے پریس کلب میں استقبالیہ تھا۔ ۵۰، ۶۰ اخبار نویس، صحافی، ادیب اور شاعر پریس کلب میں جمع تھے۔ پر تکلف عصرانہ کے بعد صلاح الدین محمد نے پھر ایک بار ہم میں سے ہر ایک کا تعارف کرایا اور خواہش کی کہ دورۂ مشرقی پاکستان کے بارے میں ہم اپنے تاثرات پیش کریں۔

مولانا رازق الخیری نے مشرقی پاکستان کے دلفریب مناظر،

مردوں اور عورتوں کی پاکیزہ اور سادہ زندگی اور بڑے صنعتی کارخانوں کا تذکرہ کیا۔ مولانا ذاکر نے مسلم اکثریت کے مذہبی رجحانات اور یہاں کے عوام کی اسلام سے قربت اور محبت پر اپنے خیالات پیش کئے۔ شریف المجاہد نے مشرقی پاکستان کی صحافت کا بطور خاص جائزہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ مغربی پاکستان کی طرح یہاں بھی بڑے شہروں ڈھاکہ اور چٹاگانگ کو چھوڑ کر دوسرے چھوٹے شہروں سے کوئی روزنامہ نہیں نکلتا ہے۔ سلہٹ، میمن سنگھ، کھلنا، جیسور وغیرہ میں جہاں انھوں نے دورہ کیا وہاں اچھے ہفتہ وار اور معیاری ماہنامے بھی نہیں ہیں۔ اس صورت حال پر امداد باہمی کے اصول اور حکومت کی سرپرستی سے قابو پایا جا سکتا ہے۔ اگر چھوٹے شہروں کے علم دوست حضرات بھی دست تعاون بڑھائیں تو ہر ضلع میں اچھے اخبارات اور رسالے جاری ہو کر زندہ رہ سکتے ہیں قومی ترقی میں صحافت کا نمایاں مقام ہے اس لئے اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ہر علاقے میں اخباری صنعت کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ حکومت اور صنعتی ادارے اشتہارات کی صورت میں ان کی مدد کریں تاکہ اخبارات عوام کی ذہنی تربیت،

علم و تعلیم کے فروغ اور ملک کی تعمیر و ترقی میں اہم حصہ لے سکیں۔

شریف المجاہد کے بعد قیوم ملک نے مشرقی پاکستان کی معیشت و معاشرت، صنعتی ترقی اور زراعتی ترقی کی جداگانہ حیثیت، سرمائے کی اہمیت اور قومی آمدنی کو بڑھانے کے طریقوں پر سیر حاصل روشنی ڈالی۔ انھوں نے نہایت وضاحت کے ساتھ کہا کہ صنعتی ترقی کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں لیکن چونکہ اس صوبے کی اکثریت زراعت پیشہ ہے اس لئے عوام کی خوشحالی بڑی حد تک زراعتی ترقی اور صحیح تنظیم پر منحصر ہے۔ چاول اور پٹ سن کی کثیر پیداوار کے ساتھ ساتھ مویشی، دودھ، گھی، مچھلی، پھل، ترکاریاں وغیرہ افراط سے پیدا کی جا سکیں تو عوام کا معیار زندگی جلد بلند ہو سکتا ہے۔ یہاں کے دیہاتوں میں خصوصاً عوام کی صحت کا معیار اچھا نہیں۔ کیونکہ وہ دودھ اور ترکاریاں کم استعمال کرتے ہیں۔ تقریر کے دوران انھوں نے امریکہ کی معاشی خوشحالی کا تجزیہ کر کے یہ ثابت کیا کہ اس ملک کو ۹۰ فیصدی آمدنی پیداواری ذرائع سے ہوتی ہے اور صرف ۱۰ فیصدی صنعتوں سے۔ اس حقیقت کو مثال بنا کر مشرقی پاکستان کے بے شمار وسائل کو بھی ترقی دی جا سکتی ہے۔ وسائل کی ترقی

نہ صرف عوام کی انفرادی آمدنی کا معیار بڑھ سکے گا بلکہ قومی آمدنی میں بھی معتد بہ اضافہ ہوجائے گا۔ مشرقی پاکستان کی سرزمین کو بہترین قدرتی وسائل مہیا ہیں اور کام کرنے والے افراد بھی۔ ضرورت اس بات کی ہے واضح منصوبہ بندی کے تحت ہر قسم کی پیداوار اور گھریلو مصنوعات کو فروغ دیا جائے تاکہ غربت و افلاس کا جلد خاتمہ ہو سکے۔

آخر میں صلاح الدین محمد کی خواہش پر میں نے بھی مختصراً اپنے تاثرات پیش کئے۔ اور میمن سنگھ کے علاقوں میں یونین کاؤنسلیں باہمی اشتراک و تعاون سے جس طرح کام کر رہی ہیں اس پر روشنی ڈالی۔ میں نے کہا کہ اجتماعی کوششوں کے بغیر ملک کی ہمہ گیر ترقی ممکن نہیں۔ دیہات ہو یا شہر ہر جگہ سماجی بہبود اور فلاحی اداروں کی ضرورت ہے۔ مشرقی پاکستان کے ان گنت مسائل میں ہر مسئلہ کے حل کے لئے حکومت کو ذمہ دار قرار دینا مناسب نہیں۔ کچھ ذمہ داری ہماری بھی ہے۔ ہمارا ملک تعمیر و ترقی کی منزل میں ہے۔ آزادی ملی ہے۔ لیکن بڑی جد و جہد اور قربانیوں کے بعد۔ ابھی ملک کی ترقی اور خوشحالی کے لئے ہمیں مزید قربانیاں دینا ہوں گی۔ تاکہ ہم نہ صرف اپنی آزادی کا

تحفظ کر سکیں بلکہ ملک کو ترقی یافتہ ملکوں کے دوش بدوش کھڑا بھی کر سکیں۔

میں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان میں ذہنی قربت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے بنگلہ ادب کی بہترین تخلیقات اردو میں ترجمہ کی جائیں اسی طرح اردو کی منتخب کتابیں بنگلہ میں تاکہ دونوں زبانیں ایک دوسرے کے قریب آسکیں۔ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ اردو جاننے والے بنگالی سیکھیں اور بنگالی جاننے والے اردو۔ پھر اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ مشرقی پاکستان سے مستحکم بنیادوں پر اردو اور بنگلہ کے معیاری رسالے شائع ہوں تاکہ دونوں زبانوں کے ادیبوں شاعروں اور فنکاروں کی تخلیقات کی اشاعت اور صوبے میں زبان و ادب کی ترقی کے لئے عام فضا پیدا ہو سکے۔ میں نے بتایا کہ ہمیں ڈھاکہ اور چاٹگانگ کے علاوہ کسی جگہ اردو یا بنگالی کا کوئی ایسا ماہنامہ نہیں ملا جسے ہم معیاری کہہ سکیں۔ اگر اس صوبے کے ذی حیثیت اور علم دوست حضرات عملی تعاون کریں تو اچھے پریسوں کا قیام اور اچھے ادب کی ترقی کے امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔

میرے تاثرات سننے کے بعد صلاح الدین محمد نے تقریر

کی اور بہت سی ان غلط فہمیوں کو دور کیا جو ملک کے دونوں حصوں
میں سیاست بازی نے پھیلائی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ملک
کے دونوں حصے ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔
عوامی سطح پر برادرانہ مفاہمت اخوت و محبت کے جو رشتے قائم
ہیں وہ نہایت مستحکم ہیں اور ہمیشہ مستحکم رہیں گے۔

رسمی شکریے کے بعد یہ تقریب ختم ہوئی۔ پریس کلب
سے افضل صاحب ہمیں اپنے گھر لے گئے اور نہایت لذیذ آم
کھلائے ہمارے مشرقی پاکستان کے سفر و قیام میں افضل صاحب
نے جس مستعدی، خلوص اور ذمہ داری سے اپنے فرائض انجام
دیے تھے اور جس طرح ہماری آسائش و سہولت کے انتظامات
کئے تھے ہم پانچوں اس سے نہ صرف متاثر تھے بلکہ ان کے
ممنون بھی وہ خود بھی دو چار کتابوں کے مصنف ہیں اس لئے ان
کی صحبت میں نہایت اچھا وقت گذرا۔ افضل صاحب ہمیں کھانے
کی دعوت دینا چاہتے تھے۔ لیکن ہماری مصروفیتوں نے اس
کا موقع نہ دیا۔ اب جو ہم وقت نکال کر ان کے گھر پہنچے تو انھوں نے
بنگال کی روایتی مہمان نوازی کا ثبوت دیا۔ کچھ دیر ٹھہر کر ہم لوگ
جی۔ ایس صدیقی صاحب کے مکان پہنچے جہاں انھوں نے پرتکلف

عشائیہ دیا۔ مولانا خیری کے قریبی عزیز ہونے کی وجہ سے انھوں نے خاص اہتمام کیا تھا۔ مولانا کے پسندیدہ اور مرغوب کھانے پکوائے تھے۔ بہترین آم مہیا کئے تھے برف کا بطور خاص انتظام تھا جو مولانا کو بیشتر جگہوں پر طلب کرنے پر نہیں مل سکا تھا کیونکہ یہاں برف کا عام استعمال نہیں۔ میں بچپن سے ہی کم خوراک ہوں۔ مشرقی پاکستان کے سفر و قیام کے دوران ایک سے زائد بار مولانا صاحب کھانے کے معاملے میں مجھے بد ذوق کا خطاب دے چکے تھے اور میں ان کے بزرگانہ اور شفقت آمیز اظہار خیال پر مسکرا کر رہ گیا تھا۔ صدیقی صاحب کے عشائیہ میں بھی میں نے شرکت سے معذوری کا اظہار کیا اور ضعیف فوق کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہا لیکن مولانا نے اجازت نہیں دی اور یہ کہہ کر ساتھ چلنے پر اصرار کیا کہ صدیقی صاحب بُرا مانیں گے۔ چنانچہ مولانا کے ارشاد کی تعمیل کی اور جب عشائیہ شروع ہوا تو زیادہ خواہش نہ ہونے کے باوجود میں نے سیر ہو کر کھانا کھایا اور مولانا سے عرض بھی کر دیا کہ اتنا اچھا کھانا یہاں کسی جگہ نہیں کھایا۔

کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد گیارہ بجے رات تک صدیقی صاحب، قیوم ملک، شریف المجاہد اور ذاکر علی کی دلچسپ باتوں

اور لطیفوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۱½ بجے ہم لوگ ہوٹل پہنچے۔

۲۹ کی صبح کو ۵ بجے بیدار ہو گئے۔ مولانا بھی جاگے ہوئے تھے چائے آ گئی اور میں نے مولانا کو لسبنز پر ہی چائے بنا کر دی۔ چائے کے ساتھ لیمو اور گرم پانی کا گلاس بھی تھا۔ چنانچہ میں نے گرم پانی میں لیمو نچوڑ کر پیا۔ یہ نسخہ قیوم ملک نے بتایا تھا اور نہار منہ گرم پانی میں لیمو نچوڑ کر پینے کے ان گنت فوائد بتائے تھے۔ مثلاً بھوک لگتی ہے، تیزابیت اور موٹاپا کم ہو جاتا ہے۔ اسے روزانہ استعمال کرنے کی صورت میں بدن میں چستی رہتی ہے وغیرہ۔ اس دورہ کے دوران مولانا کے کم خوری کے سلسلے میں طعنے سُن سُن کر میں نے اس نسخہ پہ عمل شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ مولانا بہت خوش تھے، اب یہ بات علیحدہ ہے کہ قیوم ملک کا نسخہ میرے لئے "بیتر بہدف" ثابت نہ ہو سکا۔ ۸½ بجے تک ہم لوگ تیار ہو گئے اور پروگرام کے مطابق بنگالی اکیڈیمی دیکھنے کے لئے روانہ ہو گئے۔

بنگلہ اکیڈیمی

بنگالی اکیڈیمی کو ۵۵ء میں حکومت مشرقی پاکستان نے قائم کیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ بنگلہ ایک قومی زبان کی حیثیت سے جلد ترقی کر سکے اور ادب و ثقافت کے تحفظ کا فریضہ انجام

دے سکے۔ چنانچہ اکیڈمی ایک واضح پروگرام کے تحت نہایت سرگرمی سے تحقیقاتی کام کر رہی ہے اور نایاب کتب کی از سرِ نو ترتیب و اشاعت میں مصروف ہے۔ اس اکیڈمی سے وابستہ ایک نادر لائبریری ہے۔ مشرقی پاکستان میں لوک ادب، لوک گیت اور لوک رقص کی جو روایت صدیوں سے چلی آرہی ہے۔ بنگالی اکیڈمی اس کے تحفظ میں بھی کوشاں ہے۔ ڈھاکہ کی مشہور عمارت بردوان ہاؤس میں بنگلہ اکیڈمی کے مختلف شعبے قائم ہیں معلوم ہوا مشرقی پاکستان رائٹرز گلڈ کا عارضی دفتر بھی یہیں واقع ہے۔

جب ہم اکیڈمی پہنچے تو پروفیسر سید علی احسن ڈائرکٹر بنگالی اکیڈمی نے ہمارا خیر مقدم کیا اور ادیبوں، شاعروں اور مہربانوں سے ہمارا تعارف کرایا۔ پھر وہ ہمیں مختلف شعبوں میں لے گئے اور اکیڈمی میں لغات کی تیاری اور نایاب کتب کی اشاعت کا کام دکھایا۔ پتہ چلا کہ اب تک سائنس، لوک گیتوں، اقبال کی نظموں، قدیم نایاب مسودات اور دیگر موضوعات پر مشتمل ۳۰ کتابیں چھپ چکی ہیں، ۱۵ کتابیں پریس میں ہیں، بنگلہ لغات کا کام تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ میرے دریافت کرنے پر پروفیسر صاحب نے بتایا کہ بنگلہ زبان

مسلم حکمرانوں کے ایک دور میں عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی، افسوس کہ عربی رسم الخط کی کوئی بنگلہ کتاب ہم نہیں دیکھ سکے۔ بنگالی اکیڈیمی بنگلہ زبان و ادب کی توسیع و ترقی اور ترویج و اشاعت کے لئے جس تندہی، سرگرمی، محنت اور جانفشانی سے کام کر رہی ہے اسے دیکھ کر جی خوش ہوا۔ کاش عزم و عمل کی یہی روح زندگی کے ہر شعبے میں پھونک دی جائے۔

بنگلہ زبان قدیم زبانوں میں سے ہے۔ بدھ مت کے دور سے ۱۹۴۷ء کی آزادی تک اس زبان نے تاریخ کے سورماؤں کا عروج و زوال اور سینکڑوں انقلابات دیکھے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بنگالی زبان پراکرت کی بیٹی ہے۔ سنسکرت چونکہ کبھی اور کسی دور میں بھی عوامی زبان کی حیثیت سے زندہ نہیں رہ سکی اس لئے سنسکرت کے عالموں کی کوشش کے باوجود بنگلہ زبان نے اس کے اثرات سے رفتہ رفتہ چھٹکارا پالیا اور تاریخ کے اس کلیہ کو ثابت کر دیا کہ زبان صرف وہی زندہ رہ سکتی ہے جس کی جڑیں عوام میں ہوں۔ مگدھی پراکرت سے ماخوذ ہونے کے باعث علمی بنگالی میں تت سم یعنی خالص سنسکرت کے الفاظ اب بھی موجود ہیں، لیکن مسلم سلاطین کی فتوحات کے بعد اس زبان کو

ترقی اور مقبولیت حاصل ہوتی گئی۔ پندرھویں صدی میں بنگالی عربی رسم الخط میں بھی لکھی گئی۔ پھر سترھویں صدی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں اس نے انگریزی زبان کے اثرات قبول کئے اور مغربی علوم بنگالی میں منتقل ہونا شروع ہو گئے جس کے سبب اس کے سرمائے میں علوم و فنون کا معتدبہ اضافہ ہوا۔ متحدہ ہندوستان میں عربی، فارسی اور اردو زبان کے جو اثرات تھے۔ بنگالی زبان بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہی کیونکہ اردو کی طرح اس زبان میں بھی دوسری زبانوں کے الفاظ اصطلاحات کو جذب کرنے کی کافی صلاحیت پائی جاتی تھی —— سرت چندر، ٹیگور اور قاضی نذرالاسلام وغیرہ نے بنگلہ کو آسان اور عوامی زبان کی حیثیت سے مقبول بنانے کی جو کوشش کی ہے اسے کسی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ خصوصیت کے ساتھ بنگلہ میں اسلامی ادب اور عربی و فارسی کے ان گنت الفاظ کو رواج دینے میں کیقباد، مشرف حسین اور قاضی نذرالاسلام سرفہرست ہیں۔ نذرالاسلام نے بنگلہ میں عربی۔ فارسی اور اردو کے الفاظ کو جس دریا دلی اور وسعت قلبی کے ساتھ استعمال کر کے اسے سنسکرتی اثرات سے پاک کیا ہے اسے بنگلہ

زبان وادب کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔

قدامت پرستوں نے باغی شاعر کے اس اقدام پر ناک بھویں بھی چڑھائیں، مخالفت بھی کی لیکن نذر الاسلام کی پر خلوص کوششیں کامیاب ہو کر رہیں اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک بنگلہ میں عوامی اور اسلامی ادب کی نئی روایت کا آغاز ہو گیا۔ فارسی اور عربی اوزان و بحور کا آزادانہ استعمال ہونے لگا، حافظ اور عمر خیام کے ترجمے ہوئے، غزلوں کا رواج عام ہو گیا۔ جس کا نتیجہ ہے کہ آج موضوع الفاظ، تراش خراش اسلوب اور لب ولہجہ میں مشرقی اور مغربی بنگال کی بولیوں میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ اور مغربی بنگال والے مشرقی پاکستان کی زبان کو مسلمانی بنگلہ قرار دیتے ہیں۔ آزادی کے بعد مشرقی پاکستان کے باشعور ذہین اور ہوشمند ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں نے بنگلہ زبان میں جو قیمتی اضافے کئے ہیں مستقبل کا مورخ انہیں کبھی نظر انداز نہیں کر سکے گا۔

اکیڈیمی کے وسیع ہال میں باقاعدہ جلسے کی کارروائی شروع ہوئی۔ مولانا خیری کے ایما پر شریف المجاہد، قیوم ملک نے مشرقی پاکستان کے دورے کے تاثرات اور اس خطہ ملک

کے چند در چند مسائل پر انگریزی میں تفصیل سے روشنی ڈالی۔ ان کے بعد مشرقی پاکستان کے عظیم دانشور ڈاکٹر شہید اللہ نے نہایت شستہ اردو میں تقریر کی۔ ڈاکٹر صاحب برصغیر کے چیدہ عالم اور چوٹی کے ماہرین لسانیات میں سے ہیں انھوں نے بھی میرے خیالات کی ترجمانی کی اور اس بات پر زور دیا کہ اردو اور بنگلہ ادب کے ترجمے وسیع پیمانے پر کئے جائیں تاکہ دونوں زبانیں ایک دوسرے کے قریب آجائیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک اور فکر انگیز تجویز یہ بھی پیش کی کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے باشندوں میں شادیوں کے رواج کو عام کیا جائے تاکہ دونوں بازوؤں کے رشتے مزید مستحکم ہو سکیں۔ آپ نے فرمایا کہ اسلام نے اتحاد واخوت کا جو درس دیا ہے اس کی صداقت سے انکار ممکن نہیں۔ آخر میں ڈاکٹر صاحب نے جذباتی انداز میں فرمایا:-

"میں کہتا ہوں دونوں بازوؤں میں شادی بیاہ
کے رشتے اس طرح قائم کرو کہ دونوں جگہ کا خون
ایک ہو جائے"

اراکین وفد کی جانب سے مولانا خیری نے پرخلوص استقبالیہ کا شکریہ ادا کیا اور مدیران جرائد کو مشورہ دیا کہ رسالوں کی عام

مشکلات کو دور کرنے کے لئے اپنی تنظیم کریں اور انجمن ادبی رسائل پاکستان کو تقویت دیں۔ جو کل پاکستان بنیادوں پر تمام علاقوں اور ملک کی تمام زبانوں کے رسالوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے اور ۶۵۳ سے رسالوں کے مسائل کو حل کرنے اور ان کی مشکلات کو دور کرنے کی جد و جہد کر رہی ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ اجتماعی کوششوں کے بغیر ادبی رسالوں کا زندہ رہنا مشکل ہے۔ کیونکہ نہ حکومت کو ادبی رسالوں سے خاص دلچسپی ہے نہ صنعتی اداروں اور سرمایہ داروں کو۔ یہی وجہ ہے کہ رسالوں کے مقابلے میں اخبارات کو زیادہ اشتہارات بھی ملتے ہیں اور حکومت کی سرپرستی اور تعاون بھی انھیں حاصل ہے۔

جلسے کے اختتام پر کچھ دیر ڈاکٹر شہید اللہ اور پروفیسر علی احسن سے باتیں ہوئیں۔ پروفیسر حنیف فوق بھی ہمارے ساتھ تھے یہاں سے رخصت ہو کر میں اور مولانا حنیف فوق کے ساتھ ڈاکٹر عندلیب شادانی سے ملاقات کے لئے روانہ ہو گئے اور شریف المجاہد، قیوم ملک اور ذاکر علی ہوٹل لوٹ گئے۔ ڈاکٹر شادانی سے ڈھاکہ کے قیام کے دوران کئی بار فون پر گفتگو ہو چکی تھی۔ وہ ہمیں کھانے پر بلانا چاہتے تھے۔ لیکن ہمارے لگاتار پروگراموں نے

مہلت ہی نہ دی۔ گذشتہ ۳۵ سال سے ڈاکٹر صاحب نہایت خاموشی سے زبان و ادب کی گرانمایہ خدمات انجام دے رہے ہیں۔

آپ عرصہ سے مشرقی پاکستان میں ہیں اور ڈھاکہ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو، فارسی کے صدر ہیں۔ حسیف فوق بھی ڈاکٹر صاحب کے ایما پر آزادی کے کچھ عرصہ بعد بھوپال سے ڈھاکہ آگئے تھے۔ جب سے یہیں ہیں اور یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے پروفیسر ہیں۔ ہم جب مکان پر پہنچے تو ڈاکٹر صاحب کہیں گئے ہوئے تھے۔ انھیں فون کیا گیا تھوڑی ہی دیر میں تشریف لے آئے اور نہایت محبّت سے ملے۔ تقریباً ایک گھنٹہ ڈاکٹر صاحب سے ادبی مسائل اور مشرقی پاکستان میں اردو کے موضوع پر گفتگو ہوتی رہی تھی

ڈاکٹر صاحب سے رخصت ہو کر ہوٹل پہنچے۔ حسیف فوق ساتھ آئے اور دوسرے روز صبح کسبہ ہوٹل میں چند ادیبوں کی طرف سے چائے کی دعوت میں شرکت کا وعدہ لے کر مکان چلے گئے۔

مہر انڈسٹریز کے ڈائرکٹر محمد عنایت اللہ صاحب کی طرف سے چینی ریستوران میں ظہرانہ تھا۔ ذاکر صاحب ہمارا انتظار کر رہے

تھے۔ شریف المجاہد اپنے کسی دوست کے ساتھ چلے گئے تھے۔
اس لئے ہم چاروں جناح ایونیو میں گلستان بلڈنگ کے مشہور چینی
رسیتوران پہنچے اور چینی کھانے کھائے۔ کھانوں کے کے سلسلے
میں مولانا کی رائے صحیح تھی۔ مرغ کے شوربے کے علاوہ باقی
چیزیں بس یونہی سی تھیں۔ کھانے کے بعد عنایت اللہ صاحب
ہمیں اپنی فیکٹری جو شہر سے کچھ دور تھی دکھانے لے گئے۔ جہاں
بجلی کا سامان تیار ہوتا ہے۔

۳ بجے کے قریب واپس ہوئے۔ کئی احباب ملاقات
کے لئے ہوٹل میں موجود تھے۔ چند ایک جن میں نظیر صدیقی اور
ارشد کاکوی بطور خاص قابل ذکر ہیں ہمیں موجود نہ پاکر اور پرچہ
لکھ کر جا چکے تھے۔ کچھ دیر بعد ام عمارہ، بانو اختر شہود، اور قیسیہ
جامی بھی صلاح الدین محمد کے ساتھ ملنے آگئیں۔

ام عمارہ صلاح الدین محمد کی بہن اور نہایت باشعور افسانہ نگار
ہیں، بانو اختر شہود نے بھی چند اچھی کہانیاں لکھیں۔ لیکن پھر خاموش
ہوگئیں۔ مشرقی پاکستان کی ان دونوں افسانہ نگار خواتین نے افکار
سے ہی اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا تھا اس لئے ملاقات کی وہ
بھی خواہشمند تھیں اور میں بھی، ڈھاکہ کی انجمن ادب اور ادبی

سرگرمیوں پر تفصیل سے باتیں ہوئیں اور یہ جان کر خوشی ہوئی کہ یہاں ادب اور ادبی مشاغل میں نئی نسل بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہے اور تخلیقی سرگرمیوں کی رفتار کافی تیز ہے۔

ان کے جانے کے بعد سرور بارہ بنکوی، اختر پیامی اور وحید قیصر ندوی آ گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں افضل صاحب اور رستم علی صاحب بھی آ گئے اور استقبالیہ میں چلنے کو کہا۔

سید احمد صاحب نے ہوٹل شاہ باغ میں ہی نہایت پر تکلف عصرانہ کا اہتمام کیا تھا۔ جب ہم لوگ اپنے کمروں سے نیچے ہال میں پہنچے تو وہاں کافی حضرات جمع تھے۔ اور آنے والوں کا سلسلہ جاری تھا عصرانہ شروع ہوتے ہوتے ڈیڑھ دو سو ادیبوں، شاعروں، صحافیوں، اخبار نویسوں، نمائندگان پریس، معززین شہر اور سرکاری افسروں سے وسیع ہال پُر ہو گیا۔ اس استقبالیہ کی ایک خوبی اور خصوصیت یہ تھی کہ اس میں نہ باضابطہ جلسہ ہوا نہ تقریریں ہوئیں نہ رسمی تعارف کرایا گیا۔ چائے کی میزوں پر ہم نے آزادانہ ایک دوسرے سے باتیں کیں۔ تبادلۂ خیال ہوا اور ایک دوسرے کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی۔ عصرانے میں ڈاکٹر شہید اللہ، زین العابدین اور جسیم الدین بھی تھے، انجمن ترقی اردو

مشرقی پاکستان کے روح رواں حبیب صدیقی بھی نیز معزالدین احمد شمس الہدیٰ چودھری، صادق الرحمٰن، پروفیسر علی احسن، مارننگ نیوز (ڈھاکہ) کے بدرالدین۔ اتفاق کے تفضل حسین، پاسبان کے مصطفےٰ حسین — اور کئی دیگر حضرات سے ہمیں فرداً فرداً ملاقات اور تفصیلی بات چیت کا موقع مل گیا۔

تقریباً ۷ بجے عصرانہ ختم ہوا اور ہم اپنے کمروں میں لوٹ آئے ۸ بجے پھر افضل صاحب عشائیہ میں لے جانے کے لئے آ گئے مولانا نے ان سے کہا کہ جب مہمان آنا شروع ہوں ہمیں اطلاع کر دیں۔ ہم آجائیں گے۔ تقریباً نو بجے ہم ایک اور وسیع ہال میں پہنچے جہاں عصرانے کے شرکاء کے علاوہ کئی اور معزز حضرات اور چند خواتین بھی موجود تھیں۔ کچھ دیر بعد سید ہاشم رضا صاحب بھی تشریف لے آئے اور عشائیہ شروع ہو گیا۔ یہ عشائیہ موسیٰ احمد صاحب کی طرف سے تھا۔ مولانا چونکہ قدیم تہذیبی روایات کے علمبردار ہیں اس لئے لو فیشنڈ ڈنر کے (جسے اکثر قدامت پسند "کھڑا کھانا" کہتے ہیں) کچھ زیادہ قائل نہیں۔ موسیٰ احمد صاحب نے بھانپ لیا اور مولانا کو لے جا کر مشہور اہل قلم خواتین بیگم صوفیہ کمال، بیگم شمس النہار محمود، بیگم نور جہاں ایڈیٹر رسالہ "بیگم" وغیرہ کی میز پر

لیجا کر بٹھادیا۔ مولانا اب اطمینان سے کھانا کھا رہے تھے۔ کچھ دیر کیلئے ہاشم رضا صاحب بھی وہیں جا بیٹھے اور زمانۂ طالب علمی کے دلچسپ واقعات سناتے رہے۔ عصرانہ کی طرح عشائیہ میں بھی عمائدین شہر، اعلیٰ سرکاری افسران، اخبارات کے ایڈیٹر و صحافی اور بنگلہ زبان و ادب کی مایۂ ناز شخصیتیں موجود تھیں اس طرح ہمیں پھر ایک بار ان کی قربت و معیّت کے علاوہ اُن سے گفتگو کا موقع بھی مل گیا۔

۳۰ر جون کو علی الصباح بیدار ہو گئے۔ آج ہماری روانگی تھی۔ دو ہفتے پہلے جمعہ کے دن ہی ہم نے اس سرزمین کے قدم چومے تھے۔ سوچا تو یوں لگا جیسے یہ پندرہ دن ہم نے اپنے گھر میں ہی گذارے ہیں جس کی ایک دیوار مشرق ہے اور ایک مغرب۔ فاصلہ معدوم ہو چکا ہے۔ صحن کی دو دیواروں میں فاصلے کی حیثیت بھی کیا ہے۔

پاکستان ایک اکائی ہے۔ ایک وحدت ہے اور کروڑوں ابنائے وطن اس گھر، اس وطن اور اس ملک کے وارث و نگہبان ہیں انہیں میں وہ عظیم المرتبت ادیب و شاعر ہیں جو کاکس بازار سے درۂ خیبر تک پھیلی ہوئی اس سرزمین کے عظیم ادبی، تہذیبی

اور ثقافتی ورثے کے امین ہیں جو صدیوں سے دنیا کو امن، محبت، حسن، نیکی اور سچائی کا درس دے رہے ہیں۔ یہ علاول اور کیقباد کے نغمے ہیں۔ یہ خوشحال خاں خٹک اور رحمٰن بابا کی آواز ہے۔ یہ بلھے شاہ اور سید وارث شاہ کی لے ہے۔ یہ شاہ لطیف اور سچل سرمست کا آہنگ ہے اور تخلیق و اظہار کی مشترکہ روایتیں ایک تنومند اور شاداب پیڑ کی مضبوط جڑوں کی طرح اس سرزمین میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلی ہوئی ہیں۔

پھر تاریخ کے اوراق پلٹتے ہیں اور انقلاب سے آزادی تک حقیقت کی جستجو میں اگر ایک طرف اقبال کی آفاقی لے سنائی دیتی ہے ع

اٹھو! مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو

تو دوسری طرف یہی لے قاضی نذر الاسلام کے نغموں میں ڈھل کر زنجیر و سلاسل کو پگھلا کر رکھ دیتی ہے ۔

زنجیر میں جکڑے ہوئے ہمدم مرے جاگو!
تعمیر و مساوات کا پیغام سناؤ!!
ہمدم مرے جاگو!!!

اور پھر میں یوں محسوس کرتا ہوں جیسے کاکس بازار، میامتی اور سونار گاؤں کے تہذیبی نشانات، ڈھاکہ، چٹاگانگ اور سلہٹ کے مشہور اور مقدس مآب مزارات، مسجدیں اور پرشکوہ عمارات درۂ خیبر کی بلندیوں پر استادہ ہیں اور قلعۂ لال باغ کی صدائے بازگشت قلعۂ لاہور میں سنائی دے رہی ہے۔ شالیمار باغ کا میلہ چراغاں دیکھنے والے موہنجوداڑو اور ٹیکسلا کے مکینوں کو آوازیں دے رہے ہیں۔ وقت، فاصلہ اور سمت کی طنابوں نے ماضی کی تاریخ کو حال سے بدل دیا ہے اور اس کا نام ۱۹۴۷ء کی آزادی رکھا ہے۔ آزادی جس کے چاند سورج مشرق اور مغرب ہیں۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک زندگی کی لہر ہے، روشنی ہے، حرکت ہے۔ اور دس کروڑ انسان ہیں جو ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے دفتروں، ملوں کارخانوں، کھیتوں کھلیانوں، دریاؤں، سمندروں، جنگلوں اور پہاڑوں کی وسعتوں پر حکمراں ہیں اور مجھے رخصت کرتے ہوئے باآواز بلند کہہ رہے ہیں:—

ہم ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے!

ہم ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکیں گے!!

کمرے کے دروازے پر کسی نے کھٹکھٹایا اور میرے حسین تصورات کے تار و پود بکھر گئے۔ ارے ابھی تو بس ڈھاکہ میں ہی ہوں اور ابھی کئی پروگرام باقی ہیں۔ حنیف فوق اور چند احباب آگئے ہم لوگ بنا رہے تھے۔ کسبہ ہوٹل روانہ ہو گئے۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی سے دوبارہ ملنا اور قربت کا موقع مل گیا نوشاد نوری، ارشد کاکوی، اختر پیامی، ایاز عصمی، اختر لکھنوی، شبیر علوی، زین العابدین اور کئی دوسرے ادیب وشاعر موجود تھے ناشتے کے بعد کچھ دیر ادبی موضوعات پر باتیں ہوئیں۔ مولانا نے ادبی رسالوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ ڈاکٹر شادانی نے بتایا کہ انھوں نے ماہنامہ "خاور" نکالا تھا لیکن نقصان سے بند کرنا پڑا۔ اب ارشد کاکوی ماہنامہ "ندیم" اور اختر لکھنوی "فن کار" نکال کر انھیں زندہ رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ادبی رسالوں کے لئے ابھی تک یہاں کی فضا سازگار نہیں۔ اختر پیامی نے بتایا کہ صرف بنگلہ کا رسالہ "بیگم" کامیاب ہو سکا ہے اردو کا دلربا بند ہو گیا۔ بنگلہ کا کبھی کبھی نکلتا ہے باقی دو انگریزی کے روز نامے (مارننگ نیوز اور آبزرور) تین بنگالی روز نامے (آزاد، اتفاق،

اور سنگباد، اور ایک اردو کا روزنامہ (پاسبان) شائع ہوتا ہے۔
انگریزی میں ینگ پاکستان نکل رہا ہے۔ سنا ہے رائٹرز گلڈ
اردو اور بنگلہ میں رسالے نکالنے کا قصد رکھتی ہے۔ مولانا نے
یہاں بھی اتحاد و تنظیم کا مشورہ دیا اور فرمایا کہ انجمن ادبی رسائل
پاکستان (جس کے مولانا بانی اور صدر ہیں) تمام زبانوں کے
رسالوں کی مشکلات کو دور کرنے کے لئے سالہا سال سے جدوجہد
کر رہی ہے لہذا اس سے تعاون کریں تاکہ اجتماعی کوششوں سے
رسالوں کے مسائل کو حل کیا جا سکے۔ آخر میں باصرار ڈاکٹر شادانی
سے اُن کا تازہ کلام سنا اور مزید سننے کی حسرت لے کر بمجبوری
ان دوستوں اور رفیقوں سے جدا ہوئے۔ کیونکہ ۳ بجے کے
طیارہ سے مجھے، مولانا اور قیوم ملک کو روانہ ہونا تھا۔ ذاکر صاحب
کو یکم جولائی کے جہاز میں سیٹ مل سکی تھی اور شریف المجاہد
۴ جولائی تک یہاں ٹھہرنے کا قصد رکھتے تھے۔ لہذا خدا حافظ
کہہ کر ۱۰ بجے کے قریب وحید قیصر ندوی کے گھر پہنچے اور انھیں ساتھ
لے کر حبیب میچ فیکٹری دیکھنے گئے۔ مینجر صاحب نے اول تا آخر
لکڑی کی کٹائی سے تیلیوں کی تیاری اور مسالے کی آمیزش کے بعد
پیکنگ تک تمام طریقے ہر شعبے میں لے جا کر سمجھائے اور روانگی

سے قبل نہایت خوش ذائقہ اناناس لذیذ مٹھائی اور چائے سے
خاطر مدارات کی۔ یہ ہمارے پروگرام کی آخری کڑی تھی اور اب
ہم آزاد تھے۔ چنانچہ سیدھے صدر گھاٹ پہنچے۔ میں نے
یہاں کی ایک مشہور سوغات سیتل پاٹی (نہایت نفیس چٹائی)
خرید کی۔ اناناس اور بان مولانا نے بھی میرے ساتھ خریدے۔ آج
صبح سے ٹھہر ٹھہر کر بارش ہو رہی تھی۔ خریداری کے دوران پھر بارش
شروع ہو گئی اور ہم لوگ بھیگتے ہوئے موٹر کاروں تک پہنچے اور
ہوٹل واپس ہوئے۔ کیونکہ ساڑھے بارہ بج رہے تھے اور
جمعہ کی نماز بھی ادا کرنی تھی۔

ہم گذشتہ پانچ روز سے ڈھاکہ میں تھے اور ڈھاکہ کے
متعدد بازاروں، سڑکوں، گلیوں اور نئی بستیوں سے ہمیں
گذرنے اور یہاں کے معیار زندگی کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع
مل گیا تھا۔ ڈھاکہ جتنا قدیم ہے اتنا ہی جدید بھی ہے۔ کراچی
اور لاہور کی طرح یہاں بھی زندگی کی بلندیاں اور پستیاں ہیں
بلند و بالا عمارات کے دوش بدوش کچے پکے مکانات اور گھاس پھونس
کی جھونپڑیاں ہیں۔ صاف ستھرے علاقے ہیں اور تنگ و تاریک
گوشے بھی۔ یہی فرق رہن سہن، طرز بود و باش، لباس، بول چال

اور وضع قطع بیں ہے۔ پورے مشرقی پاکستان میں صرف ڈھاکہ اور
چٹاگانگ ہی بڑے شہروں کی طرح ادب، صحافت اور تہذیبی
سرگرمیوں کے سب سے بڑے مرکز ہیں۔ چٹاگانگ کی اہمیت
اگر بندرگاہ اور بڑا تجارتی مرکز ہونے کی وجہ سے دن بدن بڑھ
رہی ہے تو ڈھاکہ بھی صوبائی دارالحکومت اور ہوائی اڈہ ہونیکے
سبب روزافزوں اہمیت حاصل کر رہا ہے۔ بنگالی اکیڈیمی۔
رائٹرز گلڈ، بلبل اکیڈیمی، ریڈیو پاکستان، ڈھاکہ یونیورسٹی، انسٹیٹیوٹ
آف آرٹس، میوزیم، بلدہ گارڈن اور ان گنت تاریخی عمارات
مسجدیں، کالج اسکول اور دینی مدرسے، محمد پور کی نئی بستی
عظیم پور اسٹیٹ، جناح ایونیو، نیو مارکیٹ، اسٹیڈیم میڈیکل
کالج، ہائیکورٹ، نبگلہ بازار، نواب پور روڈ۔ صدر گھاٹ وغیرہ
ڈھاکہ کی ادبی، تہذیبی، ثقافتی اور کاروباری سرگرمیوں کے چند
اہم مرکز ہیں۔ ڈھاکہ کی آبادی ۱۹۴۷ء سے پہلے ایک لاکھ تھی
لیکن آزادی کے بعد تقریباً دس گنا بڑھ چکی ہے اور برابر اضافہ
ہو رہا ہے۔ طبقاتی فرق کے ساتھ سادہ لباس، سادی غذا
اور سادہ زندگی ڈھاکہ ہی نہیں پورے مشرقی پاکستان کی نمایاں
خصوصیت ہے۔ مشرقی پاکستان کی اکثریت جو کھیتوں، کھلیانوں

دریاؤں اور پہاڑی علاقوں میں سانس لیتی ہے افلاس اور غربت زدہ ہے آبادی کا بڑا حصہ چاول مچھلی اور نمک پر قناعت کرتا ہے مرد عموماً تہمد اور بنیائن اور عورتیں ساڑی استعمال کرتی ہیں۔ چھتری کا استعمال عام ہے کیونکہ تقریباً ۸ ماہ بارش کا سلسلہ رہتا ہے اکثریت ننگے پاؤں نظر آتی ہے۔ نسبتاً خوشحال گھروں میں کھڑاؤں اور جوتے پہنے جاتے ہیں۔ بڑی حد تک پردہ کا رواج ہے لیکن بے پردہ خواتین نہایت سادگی پسند ہیں۔ آرائش اور تصنع سے انہیں دور کا واسطہ نہیں۔ مذہبی رجحان عام ہے۔ اکثریت بنگلہ بولتی ہے لیکن اردو تقریباً ہر جگہ سمجھی جاتی ہے۔ بڑے شہروں میں بنگلہ کے ساتھ ساتھ اردو اور انگریزی بھی بول چال کی زبان ہے۔ مجموعی حیثیت سے مشرقی پاکستان کے عوام بڑے جیالے، حوصلہ مند اور بہادر ہیں۔ ناگہانی آفات، صبر آزما حالات اور چیلنج در چیلنج مشکلات کا بڑی جی داری سے مقابلہ کرتے ہیں اور خدا کو۔ اُس عظیم طاقت کو نہیں بھولتے جس کے قبضۂ واختیار میں موت اور زندگی ہے۔ موت بلاشبہ نہایت بے رحم ہے اور زندگی نہایت حسین، تعلیم، صحت، روزگار، بھوک، غربت، افلاس سیلاب، طوفان اور آبادی میں مسلسل اضافہ اس خطۂ ملک کے

عظیم نہایت اہم اور توجہ طلب مسئلے ہیں اور ان کی جلد از جلد تکمیل پر ہی دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کے عوام کی آسودگی، خوشحالی فارغ البالی اور ہمہ گیر ترقی کا انحصار ہے۔ اس مسلمہ حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اسلام کی بہترین روایات جمہوریت مساوات اور انصاف کو عام کئے بغیر سچی آزادی کا تصور ممکن نہیں۔

ایک بجے کے قریب افضل حسین اور رستم علی بھاگے ہوئے آئے اور بتایا کہ ڈھائی بجے روانہ ہونا ہے۔ کھانے اور نماز سے فراغت پالیں۔ مولانا، ڈاکٹر صاحب اور میں جلدی جلدی تیار ہوئے اور جمعہ کی نماز قریب کی مسجد میں ادا کر کے ہوٹل واپس آئے کھانا کھایا۔ مختصر سامان سمیٹا اور ہوائی مستقر روانہ ہو گئے۔

تین بجے طیران گاہ پہنچے۔ سید احمد صاحب اور کئی احباب رخصت کرنے آئے تھے۔ ساڑھے تین بجے دوستوں اور رفیقوں کو خدا حافظ کہہ کر اور مشرقی پاکستان کی روایتی مہمان نوازی، محبت اور خلوص کے دائمی نقش لے کر مولانا، قیوم ملک اور میں جہاز پر سوار ہو گئے۔

پی آئی اے کے سپر کانسٹیلیشن نے حرکت کی رن وے کے فاصلے کو طے کیا۔ زمین سے بلند ہوا اور حسین سبزہ زاروں

وادیوں، بستیوں، دریاؤں اور پہاڑوں سے گذرتا ہوا آسمان کی وسعتوں میں گم ہو گیا ــــــ!

اِس وقت رات کے ۹ بج رہے ہیں اور ہمارا طیارہ کراچی کے ہوائی مستقر پر اُتر رہا ہے جو روشنیوں کے سیلاب میں نہایا ہوا ہے۔ میں اپنے خوابوں کی سرزمین ۔مشرقی پاکستان سے جسمانی طور پر اگرچہ فاصلے کی حد تک پھر چودہ سو میل دور ہو گیا ہوں لیکن ذہنی طور پر پہلے سے اور زیادہ قریب آگیا ہوں اور میرے احساسات کو ٹیگور نے شاعرانہ نطق عطا کر دیا ہے ــــ

"جب میں رہوں گا نہ میرے نغمے
اُس وقت بھی تیرا شباب موجود رہیگا
تیری مسرت تازہ رہے گی"

۲ بجے شب ۲۳/۲۴/۶۳ء

سفر کے بعد

(۱)

یہ سفرنامہ پورے دو سال کے بعد شائع ہو رہا ہے۔ نصف سے زیادہ کام میں نے واپسی کے فوراً بعد ختم کر لیا تھا اور ارادہ تھا کہ اسے جلد سے جلد مکمل کر لوں گا۔ لیکن ہجوم "افکار" میرے شفیق و مربی چچا اور خسر سید نواب علی صاحب قبلہ کی وفات۔ پھر میری علالت، جوش نمبر کے دوسرے ایڈیشن کی جان لیوا مصروفیات اور کئی الجھنوں نے اس ارادہ کو عملی جامہ پہنانے کی مہلت نہ دی۔ بارے آج اسے کتابی صورت میں پیش کرتے ہوئے دلی مسرت ہے کہ ایک اہم فرض سے سبکدوش ہوا۔

میرے سفر کو دو سال گذر چکے ہیں اور میرے خوابوں کی سرزمین۔ مشرقی پاکستان مجھ سے کئی سو میل دور ہو چکی ہے

لیکن فاصلہ اور وقت آج بھی میری گرفت میں ہیں اور یوں لگتا ہے جیسے صرف دو ساعتیں گزری ہیں اور میں اپنے وطن کی پہنائیوں اور وسعتوں سے جس کی سرحدیں درۂ خیبر سے شروع ہو کر کاکس بازار کے ساحلوں سے جا ملتی ہیں — کبھی دور نہیں ہوا۔ بلکہ ہمیشہ سے قریب ہوں۔ رگِ جان سے بھی قریب تر۔

مشرقی پاکستان میں جو کچھ میری آنکھوں نے دیکھا۔ میرے دل نے جو تاثر قبول کیا اور میرے دماغ نے جو سوچا۔ میں وہی کچھ پیش کروں گا۔ ان صفحات میں بطور خاص میں نے دو امور کا تجزیہ کیا ہے۔ ایک کا تعلق ادب اور ادبی مسائل سے ہے اور دوسرے کا عام زندگی اور عوام کے مسائل سے۔

سفر و قیام کے دوران مشرقی پاکستان کے ادیبوں، شاعروں فنکاروں اور دانشوروں سے ملاقات اور تبادلۂ خیالات کے مجھے متعدد مواقع ملے اور میں نے یہ محسوس کیا کہ یہاں کے تمام اہلِ قلم بلا امتیاز اپنے وطن اور اس کی عظیم و پرشکوہ ادبی اور تہذیبی روایات سے بے پناہ محبت رکھتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ادیب و فنکار عموماً خود پسند اور بد دماغ ہوتے ہیں۔ لیکن مشرقی پاکستان

یں تو ہر ادیب و فنکار کو میں نے نہایت سادگی پسند، منکسر مزاج خوش اخلاق پایا۔ ہر ایک کو تخلیق کی لگن ہے۔ اپنے فن پر محنت کرتا ہے اور ادبی و تہذیبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے اُن کے لب ولہجہ گفتار و بیان، انداز فکر اور مطالعہ کے ذریعہ اُنکی تخلیقات کا تجزیہ کرنے کے بعد مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تکلف نہیں کہ اِن ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کے پاس ماضی بھی ہے، حال بھی اور مستقبل بھی۔

ڈاکٹر انعام الحق کی مشہور کتاب "مسلم بنگلہ ساہتیہ" کے مطالعہ سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔

"سرزمین بنگال کی معلومہ تاریخ تین ہزار سال قبل مسیح تک پہنچتی ہے۔ رگ وید کے جزو "ایتاریہ آرنیاک" میں اس دیش کا ذکر "ونگا" کے نام سے ملتا ہے۔ اس عہد سے ساتویں صدی عیسوی تک قدیم بنگال متعدد قبائلی خطوں میں تقسیم رہا ہے مثلاً ونگا، پنڈرا، گوڑ، راڑھ، سما، برہما، تمرالپتی اور سمانت۔ یہ قبائلی خطے "ونگا" نام کی وحدت میں ہندوؤں کے عہد میں منسلک نہیں ہوئے بلکہ

مسلمانوں کے عہد میں ہوئے۔ ان کو متحد کرنے کا
عمل ترکوں کے عہد میں شروع ہوا اور اس
کی تکمیل مغل بادشاہ اکبر کے دور میں ہوئی۔ اکبر
کے عہد میں سارا بنگال "صوبۂ بنگال" کے نام سے
موسوم ہوا۔"

اور ذرا سوچئے —— بنگلہ دیش کی طرح بنگلہ شعر و ادب
بھی کتنا قدیم ہے؟ ـ

بدھ مت کے معرفتی نغمے،
سنسکرت ادب،
سلاطین کا اولین عہد!

ودیا پتی، بنگال کے پہلے مسلمان شاعر شاہ محمد صغیر، مالا دھر باسو
زین الدین، ہرمل، چاند قاضی اور شیخ فیض اللہ۔

پھر مغل دور —— پوتھی ادب۔ سید سلطان، شیخ پران
منگل چاند، فقیر غریب اللہ،

سترھویں صدی کے دربار اراکان کے مایہ ناز شاعر ــ مگن ٹھاکر
دولت قاضی، شاعر اعظم علاول۔

اٹھارویں صدی میں "دو بھاشی بنگلہ" یا "مسلم بنگلہ کی تحریک"

برطانوی عہد میں قدیم روایت کے علمبردار، محمد رضا، علی رضا، محمد مقیم، سید نورالدین، سید حمزہ، چوہراور حمید اللہ خاں۔

پھر فورٹ ولیم کالج کا قیام اور نثر کا پہلا دور ——

ایک طرف ایشور چندر ودیا ساگر، اکشے کمار دت، بہاری لال، مائیکل مدھو، سدن دت، بھرت چندر، بنکم چٹرجی، ہیم چندر بندھو مترا، شیلجا نند مکرجی، شانتا دیوی "بن پھول" پر لوچھ ساینال بدھ دیو بوس اور دوسری طرف میر مشرف حسین، کیقباد، محمد مزمل حق، عبدالکریم، ساہتیہ وشارد، مولانا منیر الزماں اسلام آبادی، سید اسمٰعیل حسین شیرازی، نجیب الرحمٰن، قاضی امداد الحق بیگم رقیہ سخاوت حسین اکرام الدین اور شہادت حسین۔

پھر ٹیگور اور باغی شاعر قاضی نذرالاسلام کا انقلاب آفریں زندہ و پائندہ تاریخی دور ——

بیسویں صدی کا آغاز۔

عوامی گیتوں کے خالق جسیم الدین کی مقبولیت،

۱۹۴۷ء کی آزادی۔

روایت کی علمبردار بزرگ، محترم اور ممتاز ادبی شخصیتیں۔

نئی نسل کا قافلہ۔

اسلامی مملکت کا نیا تصور۔ عوامی رجحانات، اسلامی طرزِ فکر
کے نمایاں اثرات،
تحقیق و تجسس کی نئی جولانگاہیں۔ مستقبل کے لئے جد و جہد،
ادبی عظمت، شہرت اور قدر و منزلت کا نیا دور۔

اور یہ چند نام ــــ

خان بہادر الحاج احسان اللہ۔ سید امداد علی۔ مولانا اکرم خاں، ڈاکٹر شہید اللہ، عبدالغفور صدیقی، محبوب العالم، محمد برکت اللہ قاضی اکرام حسین، مظاہر حسین، بندے علی میاں، غلام مصطفےٰ، بیگم شمس النہار، ابوالفضل، ابوالمنصور احمد۔ قاضی قادر نواز، عبدالقادر منصور الدین، ابراہیم خاں، ڈاکٹر ثنا اللہ، ڈاکٹر انعام الحق، بے نظیر احمد۔ فرخ احمد، احسن حبیب، سید علی احسن، اشرف صدیقی، ابوالحسین، روشن یزدانی، بیگم صوفیہ کمال، شمشیر علی، محمودہ خاتون صدیقہ۔ شوکت عثمان، ابوالکلام شمس الدین، علاء الدین الآزاد، ابورشد، بلبل چودھری، بیگم نورالنہار، سید ولی اللہ، زین العابدین منیر چودھری، منیف الدین، عبداللہ المفتی، عبدالجبار، محمد عبدالقاسم، محمد اشرف، صدرالدین، عبدالحق عبدالحئی، مفضل حیدر چودھری، احمد شریف، نورالمومن، عسکر ابن شیخ، نذیر احمد۔ اکبر الدین، ابراہیم خلیل

عبید الحق، دیوان محمد اشرف، تعلیم حسین، نظیر الاسلام، محمد سفیان اطہر الاسلام، جہاں آرا آرزو، سردار زین الدین، سید علی اشرف سکندر رابعہ جعفر، لیلیٰ ارجمند بانو، شاہد علی، ابو اسحٰق، بیگم یوسف جمال، سید مقصود علی، اشرف الزماں خاں، اطہر رحمٰن، حبیب الرحمٰن عبد المنان، خان معین الدین، لطیفہ رشید، شمس الرحمٰن، رشید چودھری، انیس چودھری، امین الاسلام، نثار الحق، حسن حفیظ الرحمٰن زیبو احمد، من موہن برمن، مرتضیٰ لبشیر، نور المناہد بیگم، سید جہانگیر رابعہ خاتون، عبد الرزاق، نورجہاں بیگم، سلطانہ اسلام، محمد ہامون سلطان اور دوسرے۔

بنگلہ ادب وفن کے تیرہ سو سال کی یہ ایک نامکمل اور بے ترتیب سی فہرست ہے اس کے باوجود یہ نام صدیوں کی ادبی تاریخ پر محیط ہیں اور زبان وادب کے ارتقا میں ان برگزیدہ، عہد آفریں، قد آور، عظیم منفرد اور جواں عزم شخصیتوں نے اپنے معاصرین کے ساتھ جو گرانمایہ خدمات انجام دی ہیں۔ انھیں کسی طرح نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی طرح بنگلہ شعر وادب نے بھی عہد بہ عہد ترقی کی ہے سنسکرتی ادب پر عربی اور فارسی کے اثرات غالب آئے ہیں۔ اور

ہندو مسلم تہذیب و ثقافت کے ساتھ ساتھ موضوع، ہیئت، اسلوب اور اظہار و بیان کی نئی نئی صورتیں اور نئے نئے امکانات پیدا ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے یہ سارا عمل ایک جھٹکے نہیں ہوا۔ صدیوں میں ہوا ہے اور صدیوں کے ارتقائی عمل کا اس مختصر سے سفرنامہ میں تفصیلی احاطہ ممکن نہیں۔ البتہ چند شخصیتوں چند تحریکوں اور چند رجحانات کی طرف اشارہ ضروری ہے۔

ساتویں صدی سے پہلے ہی عرب کے تاجروں اور سوداگروں کی چاٹگام اور اس کے ساحلی علاقوں میں آمد و رفت شروع ہو چکی تھی۔ رفتہ رفتہ ان کی نو آبادیات بھی قائم ہو گئیں۔ اس دور میں صوفیائے کرام، مبلغین، مشائخ اور بزرگان دین بنگال پہنچے اور تبلیغ و اشاعت کے ساتھ ساتھ اسلامی مملکت کی بنیاد رکھی، بابا آدم شہید، شاہ سلطان رومی، سلطان بایزید بسطامی، شیخ جلال الدین تبریزی، شاہ جلال یمنی۔ شاہ اسمٰعیل غازی اور دیگر مجتہدین اسلام کے ایمان افروز اور انقلابی کارنامے آج بھی ان کی تقدیس و عظمت کی شہادت دیتے ہیں۔

ہندو مسلم حکمرانوں کے دورِ حکومت میں بلا امتیاز شعراء کی قدردانی ہوتی تھی اور علم و ادب کی سرپرستی کے سبب ہندو مسلم

شعر کی تخلیقات میں تہذیب و ثقافت کی مشترکہ روایات بھی ملتی ہیں اور روایتی قصے کہانیوں کا انداز بھی۔ پندرھویں صدی میں حسین شاہ اور اس کے افراد خاندان کا دور حکومت بنگال کی ہمہ گیر ترقی اور خوشحالی کا دور ہے، چنانچہ اسی دور سے بنگلہ کی عام ترقی اور شعراء کی قدردانی کی ایک نئی روایت کا آغاز ہوتا ہے پھر صوفی درویشوں اور ولشنو مذہب کے امتزاج سے پوتھی ادب جو گاؤں دیہاتوں میں تخلیق ہوا اور جسے بنگال کا عوامی ادب کہا جاتا ہے قبول عام حاصل کرتا ہے ہزاروں گمنام شاعروں نے اس کی نشو و نما اور ترقی میں حصہ لیا سید مرتضیٰ سید فیض اللہ، سید حمزہ، کوی منگل چاند (شاہ جلال مدھو مالا کا مصنف) سید سلطان ("گیان پردیپ" کا مصنف) کوی منگن ٹھاکر (گیان ساگر کا مصنف) میتا منتی، گان، گوپی چندر گان مولنشو، منگل، بارہ ماسے یہ سب پوتھی ادب میں شامل ہیں — ساڑھے چار ہزار پوتھیاں زمانے کی دست و برد کی نذر ہو گئیں لیکن سب سے بڑے انقلاب کا بانی سترہویں صدی کا شاعر اعظم علاول ہے۔ اراکان کے موگھ دربار کا یہ صوفی شاعر چاٹگام کا رہنے والا تھا اور سنسکرت، عربی، فارسی، ہندی اور بنگلہ زبانوں کا عالم تھا۔ سچ پوچھئے تو علاول ہی جدید بنگلہ شاعری کا

پیش رو ہے اس نے نہ صرف نظامی گنجوی کی مثنویوں، سکندر نامہ، ہفت پیکر اور ملک محمد جائسی کی پدماوت کو "پدماتی" کے نام سے بنگلہ میں منتقل کیا، بلکہ بنگلہ شاعری کو نیا رنگ و آہنگ بھی عطا کیا۔ علاول کا تخلیقی سرمایہ اگرچہ کم ہے اور بیشتر اُس نے ترجمے ہی کئے ہیں لیکن ان ترجموں پر تخلیق کا گمان ہوتا ہے جس سے اُس کی ذہانت، اعلیٰ صلاحیت اور قدرت زبان و بیان ظاہر ہوتی ہے۔

اٹھارویں اور انیسویں صدی کا دور بنگلہ ادب و فن کی نشاۃ ثانیہ کا دور ہے۔ ٹیگور اور نذر الاسلام کے ہمہ گیر التفات نے نہ صرف نظم و نثر میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ بلکہ فکر و فن، اسلوب و ہیئت اور اظہار و بیان کی نئی روایات کی داغ بیل بھی ڈال دی۔ نتیجہ ظاہر ہے، بنگلہ ادب، فن، شاعری مصوری اور موسیقی میں نئے رجحانات نے فروغ پایا۔ نئی فکر نے نئے اُفق تلاش کر لیئے اور ادب و فن کی میراث خواص کے ایوانوں سے منتقل ہو کر عوام کے کچے گھروں۔ قصبوں ۔ دیہاتوں، کھیتوں، کھلیانوں اور دریاؤں کی وسعتوں اور دکھ سکھ سے لبریز سینوں میں سدا کیلئے محفوظ ہو گئی۔

آزادی سے بہت پہلے اردو داں طبقہ ٹیگور، نذرالاسلام
جسیم الدین اور دوسرے عظمت مآب ادیبوں اور دانشوروں
کی تخلیقات اور بنگلہ شعروادب کی بہترین روایات سے ترجموں
کے ذریعہ متعارف ہوچکا تھا جس کا سہرا بجا طور پر ڈاکٹر
اختر حسین رائے پوری، یونس احمر، احسن احمد اشک، سلیم اللہ
فہمی اور دلاور فگار کے سر ہے۔ آزادی کے بعد ان ادیبوں کے
ساتھ ساتھ دوسرے اردو بنگلہ جاننے والے ادیبوں کی پرخلوص
مساعی سے ترجموں کی مسلسل اور باقاعدہ روایت بھی شروع
ہوگئی۔ چنانچہ گزشتہ ۱۵ سال میں "ماہ نو" اور "افکار" نے
بنگلہ مضامین نظم ونثر کی اشاعت میں جو نمایاں حصہ لیا ہے اور
بنگلہ ادب کے شہ پاروں سے اردو کا دامن جس طرح وسیع
کیا ہے۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

اسی طرح بنگلہ اہل قلم کی سعی دکوشش سے بنگلہ جاننے
والے بھی اردو کے عہد آفریں اور مشہور وممتاز ادیبوں اور فنکاروں
سے ترجمہ کے ذریعہ واقف ہوچکے ہیں۔ آزادی سے پہلے بھی اور قیام
پاکستان کے بعد بھی سب سے زیادہ اقبال کی تخلیقات بنگلہ میں
منتقل ہوئیں۔ اقبال کے علاوہ اس دور کے مایۂ ناز اردو افسانہ

نگاروں اور شاعروں نے بھی بنگلہ ادیبوں کو کافی متاثر کیا ہے چنانچہ جن فنکاروں کی تخلیقات اب تک بنگلہ میں ترجمہ ہو چکی ہیں ان میں کرشن چندر، بیدی، عصمت، منٹو، قرۃ العین حیدر فیض، خواجہ احمد عباس، غلام عباس، شوکت صدیقی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اقبال کو سب سے پہلے کلکتہ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر امیہ چکرورتی نے بنگلہ والوں سے روشناس کرایا تھا۔ پھر اشرف خاں نے "شکوہ" کا منظوم ترجمہ کیا اور یہ سلسلہ چل پڑا۔ چنانچہ پروفیسر قاضی اکرم حسین، ڈاکٹر مطاہر حسین، ڈاکٹر شہید اللہ، امین الدین احمد، محمد سلطان، میزان الرحمان، سید علی احسن عبدالحی، تمیز الرحمن، ابوالفضل، احسن حبیب، غلام مصطفیٰ، ابوالحسین نعیم البصیر، ڈاکٹر عبدالحق فریدی، سید عبدالمنان، پروفیسر آدم الدین احمد۔ حبیب اللہ بہار، فرخ احمد، شوکت عثمان۔ اطور رحمن، معظم حسین اور ملی حسین وغیرہ کی گرانمایہ خدمات کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جنھوں نے اردو کی بہترین تخلیقات کو بنگلہ میں منتقل کر کے نہ صرف وحدت فکر و نظر کا ثبوت دیا بلکہ بنگلہ ادب کے سرمائے میں قیمتی اضافہ بھی کیا۔

اس سلسلے میں مشہور و ممتاز بزرگ ادیب و صحافی محمد اکرم خاں کے رسالہ "محمدی" کے "اقبال نمبر" کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا جو علامہ اقبال کی وفات کے بعد شائع ہوا تھا اور گراں قدر مضامین نظم و نثر پر مشتمل تھا۔

اب کچھ بنگال میں اردو ادب کے بارے میں —

اٹھارویں صدی میں جن دنوں دہلی، لکھنؤ اور حیدرآباد اردو زبان کے بڑے مرکزوں کی حیثیت سے عروج و زوال کی داستانیں سنا رہے تھے انھیں دنوں کلکتہ مرشد آباد اور ڈھاکہ میں اردو کا علم لہرا رہا تھا۔ پھر جب انگریزوں نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کی بنیاد رکھی تو بنگال میں اردو زبان و ادب کی ترقی کا نیا دور شروع ہو گیا تاریخ شاہد ہے کہ اس کالج نے دیگر زبانوں کے ساتھ ساتھ نہ صرف اردو کی نشو و نما میں گراں قدر حصہ لیا بلکہ اردو ٹائپ کو رواج دینے میں بھی پہل کی، عرصۂ دراز تک یہ کالج ادب پروری، قدردانی اور اردو نوازی کا اہم مرکز بنا رہا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بنگال میں اردو کی بنیادیں مستحکم ہو گئیں اور بنگلہ ادب کے ساتھ ساتھ اردو ادب بھی آگے بڑھتا رہا۔

بنگال کے اردو ادیبوں اور شاعروں کے تفصیلی حالات اگرچہ زمانے کی دست و برد کی نذر ہو گئے ہیں پھر بھی مرزا لطف علی کے تذکرہ "گلشن ہند" اور مولوی عبدالغفور نساخ کے تذکرہ "سخن شعراء" میں مختصر حالات مل جاتے ہیں، حیدر دہلوی مرحوم، اور ڈاکٹر عندلیب شادانی کی مساعی سے جن گرانمایہ شخصیتوں کے حالات زندگی اور ان کا مختصر کلام ہم تک پہنچا ہے ان میں عبدالغفور نساخ، نواب احسن اللہ شاہین شائق، اختر، صبا، سید محمود آزاد، نواب سید محمد آزاد، خواجہ عتیق اللہ شیدا، خواجہ بیدار بخت، شفاء الملک حکیم حبیب الرحمن خاں، آشفتہ اور عیش قابل ذکر ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ عبدالغفور نساخ اور حکیم حبیب الرحمن خاں نے زبان و ادب کی ترقی اور ترویج و اشاعت میں جو نمایاں حصہ لیا ادب کا مورخ اسے کسی طور نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ڈھاکہ سے اردو کا پہلا رسالہ "المشرق" ۱۹۰۶ء میں حکیم حبیب الرحمن خاں نے ہی نکالا تھا۔ بنگال میں اردو کی ابتداء نشوونما، ترقی و فروغ بھی عہد بہ عہد ہوا ہے۔ مختلف مضامین اور متعدد تذکروں کے مطالعے سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ بنگال میں اردو کبھی اجنبی

نہیں رہی اور بنگلہ کے دوش بدوش اردو نے بھی ارتقائی منزلیں طے کیں اور جس طرح بنگلہ نے دوسری زبانوں کے الفاظ اور سرمائے سے استفادہ کیا۔ اسی طرح اردو نے بھی دنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانوں کے الفاظ واصطلاحات کو اپنے میں جذب کر کے عوامی سطح پر قبول عام حاصل کیا۔ چنانچہ آج مشرقی پاکستان میں اردو کے خدمت گزار ہر شہر اور ہر علاقے میں آباد ہیں۔ لیکن ڈھاکہ تاریخی اور سیاسی اہمیت کے علاوہ اردو کے ایک بڑے مرکز کی حیثیت سے بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔

خالد بنگالی اور ان کے شاگرد حکیم حبیب الرحمن خاں کی ذات گرامی، اردو زبان وادب سے ان کی بے پناہ محبت، نواب ڈھاکہ کا اعلیٰ ذوق ادب، ان کی علم دوستی اور ادب نوازی، احسن منزل کے یادگار ادبی اجتماعات اور عام ادبی فضا اس بات کی غماز ہیں کہ آزادی سے بہت پہلے یہاں شعروادب کے عام چرچے تھے ۱۹۲۸ء میں ڈاکٹر عندلیب شادانی ڈھاکہ گئے اور وہیں کے ہو رہے۔ انھوں نے نہ صرف حکیم صاحب مرحوم ومغفور کا ادبی شکوہ دیکھا ہے بلکہ خواجہ بیدار بخت، سید اشرف الحسینی شرف مرزا فقیر محمد، مرزا ابوجعفر وغیرہ کی یادگار محفلوں میں بہ نفس نفیس شرکت

لکھی گئی ہے ۶.۲۸ سے اب تک ڈاکٹر صاحب موصوف نے ڈھاکہ میں رہ کر نئی نسل کی تربیت اور زبان و ادب کی آبیاری جس طرح کی ہے ادبی تاریخ اُسے کبھی فراموش نہیں کرے گی۔ قیام پاکستان کے بعد بھی ڈھاکہ کی ادبی عظمت میں کوئی کمی نہیں ہوئی بلکہ اضافہ ہی ہوا، کیونکہ ہندوستان کے ہر حصے سے کئی قد آور، نامور اور ہمہ گیر شہرت رکھنے والی شخصیتیں مشرقی پاکستان ہجرت کر کے آگئیں اور ڈھاکہ، چاٹگام اور دوسرے شہروں کو اُنھوں نے اپنا وطن بنا لیا۔ عظمت، شہرت کی منزلیں طے کرنے والوں کے ساتھ ساتھ جوان و پُرحوصلہ نئی نسل کے قافلے بھی یہاں پہنچ گئے اور گزشتہ پندرہ سال کی ادبی تاریخ شاہد ہے کہ انھوں نے اپنے فکروفن اور تخلیق و عمل سے نہ صرف زبان و ادب کی روایات کے تسلسل کو برقرار رکھا ہے بلکہ اس سرزمین اور اس کے عظیم و پرشکوہ ادبی اور تہذیبی سرمائے سے ذہنی رشتہ بھی استوار کر لیا ہے۔ یقیناً یہی وہ شخصیتیں ہیں جن سے زبان و ادب کی نئی تاریخ مرتب ہوگی۔ ان میں وہ بھی ہیں جنھوں نے تھوڑے ہی عرصے میں بنگلہ زبان پر اردو کی طرح عبور حاصل کر لیا ہے اور اب وہ اردو کے ساتھ ساتھ بنگلہ بھی مخصوص لب و لہجہ میں اس روانی سے بولتے ہیں جیسے سرا سے

یہ دونوں زبانیں جانتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ پاکستان کی آزادی، استحکام اور ادبی و تہذیبی سربلندی اسی وسیع المشربی، جذبۂ مفاہمت، بالغ نظری اور ذہنی ہم آہنگی سے عبارت ہے۔

اور یہ ہیں مشرقی پاکستان کی وہ چند مشہور و ممتاز شخصیتیں جنھیں کسی خاص ترتیب والتزام کے بغیر پیش کر رہا ہوں۔ ان میں وہ حضرات بھی ہیں جو آج بھی وہاں موجود ہیں وہ بھی ہیں جو تاریخ میں اپنا دائمی نقش چھوڑ کر ہم سے جدا ہو گئے۔ چند ایک وہ ہیں جو دوران ملازمت عرصے تک وہاں رہے اور ادبی تہذیبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ اور وہ بھی جن کا بالواسطہ یا بلاواسطہ مشرقی پاکستان کے ادب وفن سے ذہنی اور قریبی رابطہ قائم ہے۔

ڈاکٹر عندلیب شادانی، علامہ رضا علی وحشت، تمنّا عمادپوری، حکیم ناطق لکھنوی، حیدر دہلوی، کیفی چڑیا کوٹی، ماہر فریدی، سلیم اللہ فہمی۔ فضل احمد کریم فضلی، اقبال عظیم — رحمت اللہ شہاب، آصف بنارسی، مبارک مونگیری، فطرت واسطی، امیرالاسلام شرقی، عطا آصفی، جمشید مرزا، عارف بلگرامی، قربان علی عصری، ڈاکٹر شوکت سبزواری، احسن احمد اشک

کلیم اللہ، ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی۔ حنیف فوق، یونس احمر، افسر ماہ پوری، صادق القادری، قمر صدیقی، عابد دانا پوری، جمہور اکبر آبادی اے۔ ڈی اظہر، محمود ظہری، عرش لکھنوی، مسعود رضا، عطاء الرحمٰن جمیل، اختر بیابانی، وحید قیصر ندوی، یوسف علی لائق، ادیب سہیل سرور بارہ بنکوی، نظیر صدیقی۔ نوشاد نوری، ارشد کاکوی، صلاح الدین محمد، وقار راہی، اظہر قادری، سعید منیر، رفیع احمد فدائی، اختر لکھنوی، ہلال صدیقی، سید رشید احمد، حنیف مونگیری۔ جبار لطفی افضل چھپراوی، حسن عظیم آبادی، واقف بلخی، دلیل ناطقی، مقبول نقش، اسد رضا جعفری، اصغر گورکھپوری، نذیر مومن، اختر پشاوری کلیم سہسرامی، اختر ماہ پوری، محبوب خزاں، ایاز اعظمی، احمد سعدی اشتیاق احمد شوق، شاعر صدیقی، مسعود کلیم، عتیق رزمی، قدوس صدیقی مسعود ارمان، غلام محمد عمران فرحت، محمد علی اطیبی، انیس خورشید، حسن احمد عطاء الرب صدیقی۔ وقار اشدی، عاطف بنارسی، نعیم صبا، حبیب بارہ بنکوی، انور فرہاد۔ دلیل شاہد، صابر عظیم آبادی، ظفر عمر سیغام اعجاز الحق اعجاز، جاوید مہتاس، نسیم احمد، خورشید احمد، احمد زین الدین معز الدین معز، سید امجد علی، سید تسنیم احمد، واحد نظامی، حیدر صفی زین العابدین، ممتاز ذکی، عبد الرحمٰن بیخود، رئیس باغی ـــــ

اور خواتین ـــــ

بیگم شائستہ اکرام اللہ، بیگم زینت نعمانی، بیگم لقمان حمید، جہاں آرا چودھری، مسز الطاف حسین، ام عمارہ، بانو اختر محمود، ساجدہ فہمی ماہ طلعت، شیریں کرشمہ، شہناز عذرا، زینب تسنیم، نزہت سمیع نجمہ سمیع، رشیدہ برہانی، ستارہ اکرام وغیرہ

بنگلہ اور اردو کی پرانی اور نئی نسل کا یہ قافلہ تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے ان کے پاس ماضی کی عظیم روایت ہے۔ حال کا قیمتی سرمایہ اور نئی فکر ہے۔ موضوع، ہیئت اور اسلوب کے نئے تجربے ہیں، نئی روح ہے اور یہی روح سارے مشرقی پاکستان میں اس سرے سے دوسرے تک عوام کو زندگی، روشنی، حرارت توانائی، اور جدوجہد کا پیغام دے رہی ہے۔ یہ قافلہ عزم تازہ کے ساتھ مستقبل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ مستقبل جو یقیناً تابناک ہے۔ جس سے سبھی آزادی، خوشحالی، قومی امنگیں اور آرزوئیں احساس و شعور کی گہرائی اور گیرائی زبان و ادب اور علم و فن کی ترقی کے نئے امکانات وابستہ ہیں۔

بنگلہ کی مایۂ ناز شاعرہ بیگم صوفیہ کمال نے اپنی مشہور نظم "امار دیش" میں قومی انداز فکر کی کتنی صحیح اور سچی ترجمانی کی ہے ـــ

سورج کی شعاعوں کے سیلاب میں، رنگ برنگ کے پھول مسکراتے ہیں۔
دھان کی فصل جب تیار ہو جاتی ہے تو آسمان
ایک دھنک چادر ہمارے سروں پر تان دیتا ہے
مجھے وطن کی ہواؤں میں سانس لیتے ہوئے
بڑا فخر محسوس ہوتا ہے۔
وطن کی نیلی فضاؤں میں اُڑتے ہوئے پرندے
مسافروں کو دور سے اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ
قریب ہی پُرامن جزیرہ ہے
جہاں مختلف رنگ و نسل کے لوگ
مسرت اور سکون کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔
زندگی کے مختلف موڑ پر
نئے سورج کی نت نئی کرنیں
ہمارے دلوں کو گرمی پہنچا رہی ہیں
چاندنی اور دھوپ —— دونوں
چاندی اور سونا برسا کر وطن کی سرزمین کو زرخیز بنا رہی ہے۔
اور اس کی سرسبزی
میرے دل کو تسکین بخش رہی ہے۔

میرا دل و دماغ
شاندار مستقبل کی امید میں سرشار ہو رہا ہے
مجھے وطن میں بولی جانے والی
تمام زبانوں سے پیار ہے۔
میرے وطن میں۔ مختلف ثقافتیں اور تہذیبیں
ایک دوسرے سے شیر و شکر ہوتی رہتی ہیں۔
جس طرح
ایک بڑے دریا میں، مختلف چھوٹی چھوٹی ندیاں
آکر مل جاتی ہیں۔
اور دریا ان سبھوں کو
سینے میں سمیٹ کر۔ سمندر سے جا کر مل جاتا ہے۔

(۲)

اور اب مشرقی پاکستان کی عام زندگی کی ایک جھلک ــــ
ابن بطوطہ سے ابراہیم جلیس تک بنگال کی کتنی ہی تصویریں ہماری نظروں کے سامنے ہیں، تصویر کا ایک رُخ برصغیر کی مایۂ ناز ادیبہ قرۃ العین حیدر نے بھی اپنے مشہور رپورتاژ "دیپ مالا" ...

کنارے“ میں پیش کیا ہے:۔

”مشرقی پاکستان کے مکانوں کی اینٹیں بہت پرانی ہیں
ان پر کائی جمی ہے۔ یہاں کی گلیاں غلیظ ہیں، سیاح
لوگ کہتے ہیں یہاں غربت بہت زیادہ ہے۔ فقیروں
کی افراط ہے، بنگالی مسلمان بے حد پسماندہ ہے، یہاں
آئے دن کال پڑتا ہے۔ لوگ فاقہ زدہ ہیں، ملیریا اور
مچھروں کی کثرت ہے۔ موٹر کاریں بہت کم نظر آتی
ہیں۔ ڈھاکے میں انگریزی سینما صرف دو ہیں
نائٹ کلب ایک بھی نہیں، یہاں بازاروں میں لوگ
عورتوں کو نہیں تاکتے نہ آوازے کستے ہیں، اس
قدامت پرست پسماندہ بنگالی مسلمان کی سوسائٹی
طوائف کے وجود سے ناواقف ہے ۔“

ہو سکتا ہے صدیوں کا انقلاب بھی اس تصویر میں کوئی نیا اچھوتا،
چمکیلا اور خوبصورت رنگ شامل نہ کر سکا ہو۔ اس سچائی سے
کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ رنگ سادگی، حسن معصومیت کشش

لہ مشرقی پاکستان پر پہلا طویل اور مکمل رپورتاژ۔ مطبوعہ افکار سالنامہ ۶۰ء

بے پناہ دلکشی میں آج بھی بے مثل ہے ۔ "چشم بینا" کی ضرورت ہے۔

مختصر سے قیام کے دوران کسی لمحہ بھی میں اپنے وطن کی سرزمین اور اس کی مادرانہ آغوش سے جدا نہیں ہوا۔ میں نے دھرتی کے سینے سے لگ کر اس کے دل کی دھڑکنوں کو شمار کیا ہے اور یہ محسوس کیا ہے کہ اس وسیع و عریض سرزمین کے کروڑوں عوام کی زندگی صرف چمنیوں کا دھواں نہیں بلکہ کسانوں، مانجھیوں، مچھیروں اور مزدوروں کی وہ زندگی ہے جو کھلے میدانوں، کھیتوں، کھلیانوں، دریاؤں، پہاڑوں اور جنگلوں کی وسعتوں میں سانس لیتی ہے ۔ یہی مشرقی پاکستان کی اصل روح ہے اور یہی اس سرزمین کے اصل وارث ہیں، ان کی عام زندگی اُن کی ضروریات، ان کا رہن سہن اور ان کے مسائل شہریوں کی تمدنی، معاشرتی اور اقتصادی زندگی سے قطعی مختلف ہیں، اُن کے چار طرف دیر فشوں ندیوں اور ناپیدا کنارہ دریاؤں کا تموّج ہے، تلاطم ہے طوفان ہے اور ان کے وہ جذبات ہیں جن کا دوسرا نام دُکھ اور سُکھ ہے۔ ان ہی دو نقطوں پر کروڑوں عوام کی زندگیاں اُس کشتی کی مانند ہیں جو مد و جزر میں کبھی کنارِ ساحل لگتی ہے اور کبھی میان ساحل ڈوب جاتی ہے۔

جب سیلاب اور طوفان گرد و باد قیامت بن کر آتا ہے تو بیشمار آبادیاں، بستیاں، کھڑی فصلیں، جنگلات، باغات اور مویشی اس کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں اور جب تباہی کا یہ دور ختم ہوتا ہے تو بچی کھچی مخلوق پھر عزم تازہ لے کر نئی بستیوں کو بسانے اور آباد کرنے پر کمربستہ ہو جاتی ہے تعمیر و تخریب کا یہ سلسلہ صدیوں سے جاری ہے اور کون جانے کب تک جاری رہیگا۔؟!

اور جب فصلیں تیار ہو جاتی ہیں اور خوشیوں کا موسم آتا ہے تو کسانوں اور ماجھیوں کی چھوٹی سی دنیا میں قوس قزح کے کتنے ہی رنگ بکھر جاتے ہیں ۔ فرصت کی چند ساعتیں، آسودگی کے چند لمحے، قناعت کے چند ایام ۔ دکھوں کی ساری گرد جھاڑ دیتے ہیں ۔ اور پھر کسی بستی سے اکتارہ کی آواز سنائی دیتی ہے ۔ کسی گاؤں میں دوتارہ بج رہا ہے ۔ اور بھٹیالی کی تانوں سے فضاؤں کو وجد آرہا ہے ۔ کہیں بھوئیا کی لے میں سوئے ہوئے درد کو جگایا جارہا ہے ۔ کسی جگہ ماجھیوں اور کسانوں کا قافلہ جٹکا کی دھنوں میں دل کا حال سنا رہا ہے ۔ اور کسی مقام پر ساری گان کی سنگیت دریاؤں کے مخالف بہاؤ پر ماجھیوں کے جوان حوصلوں کی ترجمانی کر رہی ہے ۔ اور کہیں

سنبھالی اور منی پوری رقص کی روایت دہرائی جارہی ہے۔ کہیں معرفتی اور مرشدی نغمے روح میں سوز و گداز پیدا کررہے ہیں اور لوک گیت، لوک ناچ اور لوک سنگیت کی روایت دھوم دھام سے برقرار ہے۔

مشرقی پاکستان میں ہر طرف نالے، دریا، جھیل اور تال سیال چاندی کی طرح پھیلے ہوئے ہیں جو رگ جان کی حیثیت رکھتے ہیں اور نہ صرف اس خطۂ ملک کی دل آویزی اور حسن آفرینی میں اضافہ کرتے ہیں بلکہ یہاں کی معیشت کی تشکیل بھی کررہے ہیں، یہاں کے جیالے مانجھے دنیا کے بہترین ملاح ہیں۔ گھر گھر تالاب ہے۔ تالاب میں سفید کنول ہیں گاؤں کے کنارے حد نظر تک ناریل، کھجور، سپاری کٹھل، آم، کیلے، انناس، لیچی کے درختوں کے سلسلے ہیں کہیں دھان کے لہلہاتے ہوئے کھیت ہیں، کہیں پٹ سن کے جھومتے ہوئے پودے۔ موسم اور وقت سے بے نیاز بوڑھے اور جوان مانجھی رات دن دریاؤں اور ندیوں کے سینے پر بادبان لہراتے، طوفانوں سے کھیلتے اور گیتوں کی تانیں اڑاتے نظر آتے ہیں۔ زراعت اور ماہی گیری کے پیشوں میں

ان کی عمریں بست چکی ہیں - یہاں وہاں بازار، ہاٹ اور منڈیاں اُن کی ضرورتوں کا مرکز ہیں - اُن کی ضرورتیں محدود اور ان کی زندگی سادہ و معصوم ہے - یہاں کی معاشرت پر مذہبی تقدس کی گہری چھاپ ہے، عوام نہایت نیک نفس، خدا ترس اور مہمان نواز ہیں، غربت افلاس اور عام تعلیم نہ ہونے کے باوجود وہ نہایت مہذب اور باشعور ہیں - اُنھیں اپنے وطن اور اسکی عظیم روایات سے محبّت ہے اور وہ ناگہانی آفات و حادثات کا ہمیشہ بڑی جی داری سے مقابلہ کرتے ہیں - ان کی زندگی کے ایک رُخ کی قاضی نذرالاسلام نے کتنی صحیح ترجمانی کی ہے ؂

اے گہری ندی کی موجو!
جنم جنم سے تم مجھ کو خس و خاشاک کی مانند
بہاتی رہی ہو!
میں نے اپنے لئے جو گھر تعمیر کیا تھا
اے ندی! اسے بھی تمہاری موجیں بہا لے گئیں!
پھر میں نے چر میں پناہ لینی چاہی مگر وہ
بھی نذرِ آب ہو گیا!
اب میں سب کچھ لٹا کر، سب کچھ کھو کر موجوں کے ساتھ

بہتا جا رہا ہوں!

میں گھر دوبارہ تعمیر کر سکتا ہوں
لیکن دل کا گوہر نایاب گم ہو جانیکے بعد کہاں ملیگا؟
بھاٹا میں ایک بار دل کھو جائے تو وہ بھی
جوار کی طرف نہیں جانا چاہتا!

اے ندی!
تمہاری موجیں ساحل کا ایک ہی حصہ کاٹتی ہیں
لیکن حسن کی ندی کا وہ ایک کنارا بھی نہیں چھوڑتیں!

اور تصویر کے دوسرے رخ کا اندازہ جسیم الدین کے اس گیت سے لگئیے ہ

بادبانی کشتی کھینے والے اور دریا کے اتار پر جانیوالے
مانجھی ——
کیا تم بتا سکتے ہو کہ
اس دریا کی انتہا بھی ہے یا نہیں
آخر یہ دریا
کتنی دور تک بہتا چلا گیا ہے
جس کنارے سے ندی مل کر بہتی ہے

وہ کنارا ۔۔ آہستہ آہستہ ٹوٹ جاتا ہے
مگر یہ ٹوٹتا ہوا کنارا
ایسا معلوم ہوتا ہے گویا سو رہا ہے
اب اس ٹوٹے کنارے پر میری ناؤ
بہہ کر یہاں پہنچ جائے گی۔
بشرطیکہ میں اپنے محبوب کا دیدار کر سکوں۔
میں نے سنا ہے
اس ندی کا پانی سمندر میں مل جاتا ہے
مانجھی
میری آنکھوں کا پانی
کس دریا میں جا کر ملے گا؟!
اسی نامعلوم کنارے کے لئے
میرا نغمہ فریاد کر رہا ہے۔

کسانوں، مچھیروں اور مانجھیوں کی یہی کچھ زندگی ہے۔ یہی ان کے احساسات، اُن کے جذبات، اُن کے غم، اُن کی خوشی، اُن کے عزم، ان کے استقلال، اُن کے ولولوں، اُن کے حوصلوں، اُنکی محبت، ان کی مسرت، ان کی تمناؤں، اُن کی امنگوں، ان کی محنت

اُن کی مشقت اور ان کی شبانہ روز جدوجہد کی آئینہ دار ہے
اسی زندگی کا دوسرا نام مدوجزر ہے — لہروں کا سکون و تلاطم
ہے جسے کبھی فنا نہیں اور بقول کرشن چندر —

"کبھی کوئی چیز ختم نہیں ہوتی ۔ کسی دوسری چیز
میں تبدیل ہو جاتی ہے ۔ خوبصورتی یاد میں —
یاد نغمہ میں، نغمہ گونج میں — گونج فضا میں ۔
فضا لہروں میں اور لہروں کو کون مٹا سکتا ہے "